معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے　　فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے

دیگر ممالک میں سالانہ　ہوائی ڈاک　بیس پونڈ　یا　بتیس ڈالر

بحری ڈاک　سات پونڈ　یا　گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ۔ حافظ محمد یحیی شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

معارف

جلد ۱۵۶ عدد ۲۔ ماہ ربیع الاول ۱۴۱۶ھ ماہ اگست ۱۹۹۵ء

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

۱۹/ جولائی کو دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ جناب مولانا حکیم افہام اللہ صاحب کی صدارت میں ہوا، جس میں ملک کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے ارکان نے شرکت فرمائی اور ان سطور کے راقم کو بھی یہ سعادت میسر آئی۔ اس میں ناظم ندوۃ العلما حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ نے اپنی رپورٹ میں ندوہ کے انتظامی و تعلیمی امور سے ہٹ کر ان خطروں سے بھی آگاہ فرمایا جو اس وقت دین و ملت کو لاحق ہو گئے ہیں اور ان مسائل کی طرف بھی فاضل ارکان کی توجہ منعطف کرائی جو ہندوستان ہی نہیں دنیا کے مسلمانوں اور بالخصوص اسلامی ملکوں کو درپیش ہیں۔ مولانا کے یہ خیالات نہایت دردمندانہ اور اس قابل ہیں کہ مدارس کے ذمہ دار ان پر بڑی سنجیدگی سے غور کریں اور اس سلسلہ میں اپنا کلیدی رول ادا کر کے اسلام اور مسلمانوں کی سر بلندی کا سامان کریں۔

انہوں نے مدارس دینیہ اور ان کے علما و فضلا کے تاریخی کردار کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ مدارس نے ہمیشہ اپنے زمانے کے چیلنج کا سامنا کیا، وہ دراصل اسلام کے قلعے اور ملت کی نئی نسل کو ذہنی و فکری ارتداد اور تحریف و انحراف سے بچانے کے مرکز تھے، جہاں علم راسخ و ایمان راسخ اور دین پر ثبات و استقامت کا جذبہ اور ان کی علانیہ دعوت و تبلیغ کا ایسا مزاج بنتا تھا جو فضلائے مدارس کو دین کے کسی نقطہ و شوشہ سے دست بردار نہیں ہونے دیتا تھا۔ مدارس کے اسی شاندار کردار کی وجہ سے برصغیر میں دینی و ملی تشخص باقی ہے، عقائد بڑی حد تک محفوظ ہیں، دین کے فرائض و ارکان زندہ ہیں، مساجد آباد ہیں، حج و عمرہ اور عربی زبان اور علوم دینیہ کے ذریعہ جزیرۃ العرب اور حجاز مقدس سے ربط و تعلق قائم ہے۔

فضلائے مدارس کی سرگرمیاں ہندوستان ہی تک محدود نہیں تھیں بلکہ عالم اسلام بھی ان کے وسیع دائرے میں شامل تھا، تحریک خلافت، ترکوں کی حمایت اور جزیرۃ العرب کے تقدس کی حفاظت ہی میں پیش پیش نہیں رہے بلکہ ہندوستانی علما نے صلیبی حملوں اور تشکیک و انتشار انگیز لٹریچر کا ایسا مقابلہ کیا جس کی مثال مسلمان اکثریت کے ملکوں میں بھی نہیں ملے گی۔ انہوں نے نہ کبھی بیرونی اسلامی ملکوں سے آنکھیں بند کیں اور نہ وہاں اٹھنے والے فتنوں، تشکیکی حملوں، الحاد و لادینیت اور قومیت عربیہ کی خطرناک اور بعید نتائج رکھنے والی مخالف اسلام دعوت کو نظر انداز کیا، اس سلسلے میں بطور واقعہ ندوۃ العلما کے امتیاز و تفوق اور ان بیرونی فتنوں کا نوٹس لینے میں فضلائے ندوہ کی سبقت و تقدم کا ذکر کیا جو مرکز اسلام میں ارتیاب و تزلزل پیدا کرنے والے بلکہ نصرانیت،

یہودیت اور لادینیت کے لئے راستہ کھولنے والے تھے۔

مدارس دینیہ کا تاریخی جائزہ لینے کے بعد مولانا نے اس دور کی ریشہ دوانیوں اور ان الحادی و ارتدادی کوششوں کا ذکر کیا جو اسلامی ممالک اور ممالک عربیہ کو اسلامی و دینی حمیت و غیرت سے محروم کرنے کے لئے شروع کی گئی ہیں، اس سلسلے میں اسلام کی بیخ کنی اور اس سے ہمیشہ کے لئے چھٹی پانے کی کوشش میں یہودی دماغ و شطارت اور مسیحی طاقت و اقتدار کے ہمنوا اور دمساز بن جانے کا تذکرہ کیا اور اس کا یہ نتیجہ بتایا کہ ممالک عربیہ میں دین کی حمیت اور اسلام پر افتخار، جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں کمزور و نادر اور صاحب اقتدار طبقہ میں معدوم و مفقود ہو گیا ہے۔ لادینیت، تشکک و ارتیاب سے نفرت اور جذبہ جہاد اور شوق شہادت تو درکنار ان چیزوں سے استنکاف ہو گیا ہے اور مغربی تہذیب و اقتدار سے بیزاری اور ان سے آزاد ہونے کی سعی و جہد بھی ختم ہوتی جارہی ہے، حکومتوں کا رخ آزادی و نامذہبیت کی طرف ہوتا جارہا ہے، بعض عرب ملکوں میں دین و اہل دین سے کھلی محاذ آرائی ہے، ترقی یافتہ عرب ملکوں میں صاحب اقتدار طبقہ اور جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے حالات سخت دل خراش اور باعث شرم ہیں اور یہ ناپسندیدہ اثرات خلیج کی ریاستوں، کویت، بحرین وغیرہ اور کسی حد تک (خاکم بدہن) سعودی عرب میں پہنچ رہے ہیں۔

اس کے تدارک کے لئے مولانا نے مدارس عربیہ کے ذمہ داروں کو سنجیدگی سے غور کرنے اور مدارس میں عربی زبان کی تعلیم کے معیار کو بلند کرنے پر زور دیا تاکہ ان کے فضلا اسلامی ممالک میں تقریر و تحریر کے ذریعہ دعوت دین کا کام کر سکیں اور وہاں کے نوجوانوں، دانشوروں اور صاحب اختیار طبقہ کو متاثر کر سکیں، اسی کے ساتھ انہوں نے اپنے ملک میں ہندو احیاینت کی زبردست اور خطرناک تحریک کا مقابلہ کرنے کے لئے بھی فضلائے مدارس کو تیار ہونے اور رہنے کی دعوت دی جس کا مقصد اس ملک کو اسپین بنانا ہے تاکہ یہاں صرف ایسے نسلی مسلمان رہ جائیں جن کی تہذیب و معاشرت، عائلی قانون اور اعتقادی سانچہ بدل جائے اور وہ ہندو دیو مالا کو قبول کر لیں، یہ خطرناک صورت پیدا کرنے کے لئے نصاب تعلیم، ذرائع ابلاغ اور سیاسی اثرات سے کام لیا جارہا ہے۔ مولانا نے جن خطروں سے آگاہ فرمایا ہے ان سے عام لوگ بھی واقف ہوں گے مگر مدارس کے موجودہ حالات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں، یہاں ان پر تبصرہ کا موقع نہیں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ وہ حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ بر آ ہوں۔

مولانا علی میاں نے اپنے خطبہ میں یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ندوۃ العلما کی غرض و غایت یہی تھی، اس لئے موجودہ دور کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے بھی ندوہ کو آگے آنا ہو گا اور مخالفتوں سے بے پروا ہو کر تمام مدارس کی رہنمائی اور قیادت کرنی ہو گی، ندوہ کے ابتدائی دور میں علامہ شبلی اس تحریک

کے سب سے زیادہ پرجوش اور سرگرم حامی تھے اور گو اُس وقت ان کو ارکان ندوہ کے ایک گروہ کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا مگر ان کی وفات کے بعد ان کی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ ان کا خاص مطمح نظر یہ تھا کہ وہ اپنے سامنے اور اپنے بعد بھی علما کا ایک گروہ ایسا چھوڑ جائیں جو وقت کے چیلنج کا مقابلہ کرے اور نئے زمانے میں اسلام کی نئی ضرورت کو پوری کرتا رہے؛ اس کے لئے انہوں نے پرزور مضامین لکھے اور پرجوش تقریریں کیں جن میں ندوۃ العلما کی ضرورت و اہمیت اور غرض و غایت بیان کرتے ہوئے واضح کیا کہ عربی تعلیم کا پرانا نصاب محتاج اصلاح ہے۔ ہمارے علما کو نئے زمانے کی نئی ضرورتوں کا احساس ہونا چاہئے تاکہ وہ وقت کے چیلنج کا جواب دے سکیں۔

ندوۃ العلما کی تحریک کے آغاز سے پہلے ہی ان کو اس ضرورت کا احساس اچھی طرح ہو گیا تھا اور جب روم، مصر و شام تشریف لے گئے تو انہیں اس کا احساس اور شدت سے ہوا چنانچہ اپنے سفرنامہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں "اس سفر میں جس چیز کا تصور میری تمام مسرتوں اور خوشیوں کو برباد کر دیتا تھا وہ اسی قدیم تعلیم کی ابتری تھی، یہ مسئلہ آج کل ہندوستان میں بھی چھڑا ہوا ہے اور تعلیم قدیم کی ابتری پر عموماً رنج و افسوس کیا جاتا ہے، لیکن میرا افسوس دوسری قسم کا تھا، ہمارے ملک کے نئے تعلیم یافتہ پرانی تعلیم پر جو رنج اور افسوس کرتے ہیں، وہ درحقیقت رنج نہیں، بلکہ استہزا اور شماتت ہے، میں اگرچہ نئی تعلیم کو پسند کرتا ہوں اور دل سے پسند کرتا ہوں، تاہم پرانی تعلیم کا سخت حامی ہوں اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کی قومیت قائم رہنے کے لئے پرانی تعلیم ضروری اور سخت ضروری ہے، اس کے ساتھ جب یہ دیکھتا ہوں کہ یہ تعلیم جس طریقہ سے جاری ہے وہ بالکل بے سود و بے معنی ہے تو خواہ مخواہ نہایت رنج ہوتا ہے" اسی لئے ندوۃ العلما کی تحریک ان کے دل کی آواز بن گئی اور وہ اس میں اس قدر جوش و اخلاص سے شریک ہوئے کہ سب پر چھا گئے، آج اگر تعلیم کو سودمند اور بامعنی بنانا ہے تو ایسے باخبر علما ہونے چاہئیں جو نئے فتنوں کا نوٹس لیں اور وقت کے چیلنج کا جواب دیں اور اسلام کی حقانیت و صداقت کو مدلل طور پر ثابت کر سکیں۔

وقت کی نباضی اور زمانہ شناسی علامہ شبلی کا طغرائے امتیاز تھا، انیسویں صدی میں اسلامی دنیا یورپ کی سیاسی غلامی کے ساتھ ہی اس کی ذہنی غلامی میں بھی گرفتار ہو گئی تھی، ہندوستان پر انگریزوں کا مکمل تسلط ہو گیا تھا، ان کا اصل نشانہ یہاں کے مسلمان تھے جن پر وہ مختلف سمتوں سے حملے کر رہے تھے سب سے زیادہ ضرر رساں حملہ مستشرقین کا تھا جو عربی زبان اور اسلامی علوم کے ماہر تھے، یہ اسلامی لٹریچر سے غلط اور غیر معتبر واقعات کو ڈھونڈ کر اور صحیح روایات میں تدلیس و ملمع سازی کر کے انہیں ایسی بدنما شکل میں پیش کر رہے تھے کہ خود مسلمانوں کو بھی اپنے مذہب اور تاریخ سے گھن آنے لگی تھی اور ان کے تعلیم یافتہ طبقہ میں یہی اعتراضات تیزی سے پھیل کر ان کے عقیدہ کو متزلزل کر رہے تھے اس چیلنج کو قبول کر کے اسلام کی خدمت کی سعادت حاصل کرنے والے علامہ شبلی ہی تھے۔

مقالات

٭مولانا حمید الدین فراہی کا نظریۂ نظام القرآن

(اصول و ماخذ)

پروفیسر محمد راشد ندوی، علی گڑھ۔

تمہید میں مدرستہ الاصلاح میں آکر عجیب و غریب فرحت و انبساط محسوس کرتا ہوں۔ میری نظر جب مدرسہ کے چاروں طرف اٹھتی ہے تو مجھے ہر سمت سے لفظ قرآن کی آواز سنائی دیتی ہے، یہاں تک کہ ہم یہاں کے در و دیوار پہ کان لگائیں تو وہاں سے بھی قرآن کے اسرار و رموز، اس کے اعجاز و بلاغت اور اس کی عظمت و شوکت کی نئی نئی ترکیبیں اور نئے نئے اسالیب سُنائی دیں گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ادارہ کی بنیاد جن بزرگوں نے رکھی تھی ان کے دل میں اسلام کا درد و سوز اور اسلام کی تبلیغ کا جوش و ولولہ تھا۔ ایک چھپر سے اس ادارہ کی ابتدا ہوئی اور آج یہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے اہم اسلامی مرکزوں میں شمار ہوتا ہے۔ جن عظیم شخصیتوں نے اس ادارہ کو عالمی شہرت عطا کی ان کا ذکر اس وقت میرا مقصود نہیں ہے بلکہ میں ان کی کوششوں کو ایک عظیم نعمت سے تعبیر کرتا ہوں۔ اسی لیے بطور تحدیث نعمت ان کا تذکرہ میں نے مناسب سمجھا۔

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔ (الضحیٰ ۹۳: ۱۱) اور اپنے خداوند کی نعمت کا بیان کیجیو۔

٭ یہ مقالہ مدرستہ الاصلاح سرائمیر اعظم گڈھ میں نظم قرآن کے موضوع پر منعقدہ مورخہ ۷ تا ۸ اکتوبر ۹۴ء کے لیے لکھا گیا تھا۔

یہ ادارہ اپنی علمی ترقی کی منزلیں طے کر رہا تھا اور ہندوستانی مسلمانوں کی توجہات کا مرکز بنا ہوا تھا کہ اسی زمانہ میں ایک مرد قلندر جس نے ہندوستان کے مختلف علمی و ادبی اداروں میں تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دینے کے بعد اپنی آخری زندگی میں اس ادارہ کو اپنی آخری منزل بنایا تھا، وہ اساتذہ میں اس طرح گھل مل گیا کہ دور سے دیکھنے والا کبھی نہیں سمجھ سکتا کہ یہ وہی انسان ہے جو کل تک اعلیٰ عہدوں پر سرفراز رہا ہے اور آج اس نے سب کچھ چھوڑ کر یہاں کے اساتذہ و طلبہ کو متاع عزیز سمجھ کر اس ادارہ سے تعلق کو باعث افتخار بلکہ یوں کہیے کہ علم و ادب کی ترقی کا ذریعہ سمجھ لیا ہے اور یہاں کے قیام کا ایک ایک لمحہ اسکے لیے قیمتی ہے یہ حضرت مولانا علامہ حمید الدین فراہیؒ کی ذات گرامی ہے۔

قرآن مجید سے مولانا فراہی کی غیر معمولی وابستگی

جب مولانا حمید الدین فراہیؒ کا نام آتا ہے تو قرآن مجید کا تصور ان سے وابستہ معلوم ہوتا ہے۔ گویا قرآن مجید کی خدمت اس مرد قلندر کا سب سے بڑا سرمایۂ حیات ہے۔ ظاہر ہے ایک انسان جو اپنی زندگی کے ایک ایک لمحہ کو قرآن مجید کے اسرار و رموز کے سراغ کے لیے وقف کر دے یقیناً وہ لوگوں کو کچھ ایسے جواہر دے گا جو ان کے لیے بالکل نئے اور نرالے ہوں۔ قرآن مجید جیسا کہ خود مولانا حمید الدین فراہیؒ فرماتے ہیں کہ:

اس کائنات کا ایک اہم معجزہ ہے۔ یوں تو کائنات کا ہر جز اور ایک ایک ذرہ ایک معجزہ ہے لیکن ان کے مقابلہ میں قرآن مجید کا معجزہ ہونا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ انسان اس کائنات میں اشرف المخلوقات ہے اور کائنات کی ہر چیز کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے فائدہ اور آرام کے لیے پیدا کیا ہے:

أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ
مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ

تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ ہی ہے جس نے
آسمانوں اور زمین کی چیزوں کو تمہاری

خدمت میں لگا رکھا ہے۔ (لقمان ۳۱: ۲۰)

لیکن قرآن مجید کی حیثیت عام انسانوں کے لیے کائنات کی دوسری چیزوں کی طرح نہیں ہے جن کو نظر انداز کر کے وہ زندگی بسر کر سکیں۔ قرآن مجید تمام انسانوں کے لیے رشد و ہدایت اور عقل و ادراک کا ذریعہ ہے اور اگر انسان اس سے استفادہ نہ کرے تو وہی اشرف المخلوقات عام حیوانوں سے بھی بدتر ہے۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا
وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا
وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا
أُولٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ
أُولٰئِكَ هُمُ الْغٰفِلُونَ

ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں اور
ان کے آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں
اور ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔
یہ چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی
زیادہ گمراہ ہیں، یہی لوگ ہیں جو بالکل
بے خبر ہیں۔ (اعراف ۷: ۱۷۹)

اس سے یہ پتہ چلا کہ اس کائنات میں جو رموز اور قیمتی خزانے ہیں انسان اپنی محنت اور اپنے علم سے ان کا سراغ لگا سکتا ہے اور ان کی مدد سے اپنی زندگی کو بہتر سے بہتر بنا سکتا ہے لیکن اگر وہ قرآن مجید کی روشنی سے محروم ہے تو یہی کائنات انسان کیلئے تاریکی سے بھی بدتر ہے:

كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ
مِّن فَوْقِهِ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ سَحَابٌ
ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا
أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا

جیسے ایک گہرے سمندر کے اندر تاریکیاں
ہوں، موج کے اوپر موج اٹھ رہی ہو،
اوپر سے بادل چھائے ہوئے ہوں، تاریکیوں
پر تاریکیاں چھائی ہوئی ہوں، اگر اپنا

وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ (نور ۲۴ : ۴۰)

ہاتھ بھی نکالے تو اس کو بھی نہ دیکھ پائے اور جس کو اللہ روشنی نہ بخشے تو اس کے لیے کوئی روشنی نہیں۔

یہاں نور سے مراد قرآن مجید ہے جو رشد و ہدایت کا ذریعہ ہے۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو کائنات کا ہر ذرہ اپنی جگہ معجزہ اور راز سربستہ ہے اور قرآن مجید کی اہمیت انسان سے بھی زیادہ ہے کیونکہ انسان کا وجود بغیر کلام پاک کے وجود کے بیکار ہے۔ اسی لیے ہر زمانہ میں اہل علم اور اہل فکر و وجدان نے قرآن مجید کے اسرار و رموز تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور اپنے علم و بساط کے مطابق جو چیزیں ہاتھ آئیں ان کو دوسروں تک پہنچا دیا۔ قرآن مجید کا یہی سب سے بڑا معجزہ ہے کہ اس کے اسرار و رموز کبھی ختم نہیں ہوں گے اور ان تک پہنچنے کی جتنی کوششیں کی جائیں گی، نئی نئی چیزیں سامنے آتی جائیں گی کلام پاک کی تفسیر و تعبیر کا یہ سلسلہ ہمیشہ سے رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ان کوششوں کے نتیجہ میں جہاں بہت سے اسرار و رموز کی وضاحت ہوئی وہیں کتاب الٰہی سے متعلق بہت سے علوم وجود میں آئے جن سے اسلامی ثقافت کا سرمایہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور ان کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا گیا۔ قرآن مجید سے متعلق جو علوم وجود میں آئے ان میں سے علم نظام القرآن بڑی اہمیت کا حامل ہے، اس علم کے سلسلہ میں متقدمین سے لیکر متاخرین تک کی کوششیں قابل ستائش رہی ہیں۔ لیکن اس صدی میں مولانا حمید الدین فراہیؒ نے اس علم کو جتنی اہمیت دی، متقدمین سے لے کر متاخرین تک اتنی کسی نے نہیں دی، مولانا فراہیؒ نے نظام القرآن کو اپنی زندگی کا سب سے اہم اور مقدس مشغلہ بنایا اور اس سلسلہ میں انہوں نے جو اصول و نظریات پیش کیے ان کی اہمیت و نزاکت سے منکرین نظام القرآن بھی متاثر ہوئے۔

مولانا فراہی اور نظام القرآن کا تصور

مولانا کے ذہن میں نظام القرآن کا تصور کیسے پیدا ہوا اور اس علم کی اہمیت ان کے دل و دماغ میں کیسے آئی؟ اس کی وضاحت کے لیے یہاں ان کی عبارت نقل کی جاتی ہے :

"اللہ تعالیٰ کی توفیق و عنایت سے میں نے اپنی تفسیر نظام القرآن میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ آیات قرآنی کے باہمی تعلق کو واضح کر دوں اور قرآن کریم کی ایک ایسی سادہ اور صاف تفسیر لکھوں جو ان تمام اختلافات سے پاک ہو جو ہمارے اندر عہد نبوت کے بعد پیدا ہوئے ہیں، میں نے ہر آیت کا مفہوم اس کے مشابہ دوسری آیت کی روشنی میں متعین کیا ہے اور ہر سورہ کے نظام کو اس کی تہ میں اتر کر اس کے سیاق کو سمجھ کر معلوم کرنے کی کوشش کی ہے پھر اس جد و جہد سے جو کچھ سمجھ میں آیا اس کو عقل و نقل سے پوری طرح مدلل کیا ہے، میں پورے اطمینان قلب کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ نظم کی تلاش میں میں نے کسی شخص کی پیروی نہیں کی ہے بلکہ صرف اللہ کی بخشی ہوئی بصیرت میری رہنما رہی ہے۔ تاہم یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہوگا کہ قرآن کے اندر نظم کی تلاش میں میں تنہا ہوں۔ مجھ سے پہلے بھی علماء کی ایک جماعت نے اس راہ میں کوشش کی ہے اور اس موضوع پر کتابیں بھی لکھی ہیں، چنانچہ علامہ سیوطیؒ "الاتقان" میں لکھتے ہیں کہ "ابو حیان کے شیخ علامہ ابو جعفر بن زبیر نے خاص اس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے اس کا نام "البرهان فی مناسبة سور القرآن" ہے۔ ہمارے ہمعصروں میں شیخ برہان الدین بقاعی نے بھی اپنی کتاب "نظام الدرر فی تناسب الآی والسور" میں نظم کو خاص طور سے پیش نظر رکھا ہے اس کے بعد علامہ سیوطیؒ نے خود اپنی کتاب کا بھی ذکر کیا ہے جس میں سورتوں اور آیتوں کی مناسبت

کے علاوہ اعجاز القرآن کے مختلف پہلو بھی انھوں نے بیان کیے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ نظم کا علم ایک نہایت اعلیٰ علم ہے۔ اس کے اشکال کی وجہ سے علماء نے اس سے بہت کم بحث کی ہے۔ امام فخرالدین رازی تنہا شخص ہیں جنھوں نے اس کی طرف سب سے زیادہ توجہ کی ہے انھوں نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ قرآنی حکمت کا بڑا حصہ ترتیب و نظم کے اندر چھپا ہوا ہے"۔

مولانا مزید لکھتے ہیں :

"اس کے بھی بالمقابل ایک دوسری جماعت بھی ہے جس کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں کسی قسم کا نظم نہیں ہے چنانچہ شیخ عزالدین بن سلام لکھتے ہیں کہ "قرآن مجید بیس سال سے زیادہ کی طویل مدت میں مختلف حالات کے لیے گوناگوں احکام لے کر نازل ہوا جس چیز کا نزول اس طرح ہوا ہو اس میں کسی قسم کا ربط و نظم نہیں ہو سکتا"۔ یہ علماء کے دو مذاہب ہیں ان دونوں مذہبوں کے حامی و موید ہمارے یہاں موجود ہیں، میرے نزدیک پہلا مذہب صحیح ہے اور میں اس کا پیرو ہوں"۔

آگے چل کر مولانا لکھتے ہیں :

"مجھ پر نظم کا دروازہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے سب سے پہلے سورہ بقرہ اور سورہ قصص میں کھولا اور اس کی طرف میری رہنمائی باہر سے نہیں بلکہ خود قرآن کے اندر سے کی۔ میں قرآن کی تلاوت کا ہمیشہ سے دلدادہ رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہوں کہ میری سب سے زیادہ لذیذ اور محبوب کتاب یہی ہے۔ میں سنا کرتا تھا قرآن مجید چونکہ مختلف اوقات و حالات میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا ہے۔ اس وجہ سے بلحاظ اعتبار سب سے منتشر کتاب ہے۔ لیکن دو سورتوں میں مجھے نظم معلوم

ہوگیا تو بقیہ سورتوں پر غور و فکر کرنے کی مجھے تحریک ہوئی"۔

مولانا کی ان عبارتوں سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ نظم قرآن کی طرف رہبری انکی وجدانی کیفیت نے کی اور بلاشبہ یہ کیفیت قرآن مجید سے والہانہ لگاؤ کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے، قرآن مجید مختلف احکام و مسائل اور حِکَم و عبر کا مجموعہ و مرقعہ ہے۔ اسلیے قرآن مجید سے جس انسان کو جتنا لگاؤ اور شغف ہوگا اسی کے بقدر اس کے سامنے جزئیات سے کلیات تک روشن و عیاں ہوں گے اور قرآن مجید کا حسن و جمال ایک وحدت کی شکل میں اسے نظر آئے گا اسی طرح جیسے شیشہ میں ایک حسین منظر اپنی پوری کیفیت کے ساتھ دیکھنے والے کو نظر آتا ہے، آئینہ میں جو منظر نظر آتا ہے وہ مرئی ہوتا ہے اس لیے لوگ آسانی سے اس کو تسلیم کر لیتے ہیں، لیکن فکر و وجدان کے آئینہ میں جو چیز نظر آتی ہے اس کو ہر انسان نہیں دیکھ سکتا۔ اس کو صرف وہی دیکھ سکتا ہے جو سوچنے اور غور کرنے کے بعد ایک کیفیت اپنے اندر پیدا کر لینے میں کامیاب ہو جائے۔

علم نظام القرآن اور مولانا فراہیؒ کا امتیاز و تفوق یہاں یہ چیز بڑی قابل غور ہے کہ مولانا فراہیؒ اپنے معاصر علماء میں واحد ایسے شخص ہیں جنھوں نے اس علم کی طرف توجہ کی۔ ہندوستان سے لے کر عرب و اسلامی ملکوں میں انیسویں اور بیسویں صدی کے اندر جو علماء و مفسرین پیدا ہوئے ان کی محنتیں اور کاوشیں ہمارے سامنے ہیں، ان سب نے اپنے اپنے انداز میں قرآن مجید کی خدمت انجام دی اور قرآن مجید سے متعلق بہت بڑا لٹریچر اردو و عربی اور دیگر زبانوں میں وجود میں آیا۔ عرب ممالک میں شیخ محمد عبدہ اور ان کے شاگرد رشید رضا کی تفسیر "المنار" بعد کے مفسرین میں شیخ شلتوت، محمد شیخ مدنی، شہید سید قطب، طنطاوی جوہری اور ہندوستان میں نواب صدیق حسن خاں، مولانا محمود الحسن، مولانا شبیر احمد

عثمانی، مولانا ابوالکلام آزاد قابل ذکر ہیں۔ بعد کے مفسرین میں مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ ہیں۔ ان کی تفسیری خدمات سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا لیکن جب ہم مولانا حمیدالدین فراہیؒ کا موازنہ ان حضرات سے کرتے ہیں تو مولانا فراہیؒ اپنے علمی نقطۂ نظر اور فکر میں بالکل تنہا نظر آتے ہیں۔ اس پہلو سے مولانا کی اہمیت خاص طور سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ہندوستان کی سرزمین اور یہاں کے خالص عجمی ماحول میں جو عربی زبان وادب کے لیے بالکل سازگار نہیں، مولانا فراہیؒ نظم قرآن کی تلاش میں سرگرداں ہوتے ہیں اور عربی زبان وادب اور نقد و بلاغت ہی کو اپنا اصل ذریعہ اور اصل ہتھیار تصور کرتے ہیں۔ جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں کہ قرآن کے نظم کا تصور اور اس کے اندر الہامی کیفیات خود قرآن مجید کی تلاوت اور مطالعہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ اس میں وہ کسی مفسر یا عالم کے پیرو نہیں ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ علمی دنیا میں جہاں تک اصول وضوابط کا تعلق ہے ان کی ترتیب و تنسیق اور تصنیف و تالیف میں ایک عالم، دوسرے عالم کی تصنیف سے مدد لے سکتا ہے، لیکن جہاں تک فن کا تعلق ہے اس میں انسان کا خود صاف ستھرا اور پاکیزہ ذوق و وجدان رہنمائی کرتا ہے جس کو قرآن مجید نے حکمت سے تعبیر کیا ہے:

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا۔ (بقرہ-۲: ۲۶۹) — اور جسے حکمت ملی اسے خیر کثیر کا خزانہ ملا۔

مولانا فراہیؒ کے ذہنی نشوونما کے مراحل

علم نظام القرآن کی طرف مولانا فراہی کی توجہ کیسے مبذول ہوئی اور اس کے افہام و تفہیم کے لیے انہوں نے جو طریقے اختیار کیے وہ انہیں کہاں سے ملے؟ اس کا پتہ لگانے کے لیے مولانا کی ذہنی نشوونما کے مراحل پر غور کرنا ضروری ہے جنکو ہم چار مرحلوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ پہلا مرحلہ وہ ہے جس میں مولانا نے اپنی ابتدائی تعلیم سے

لے کر عربی اور فارسی زبان وادب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی، اس مرحلہ میں مولانا کے مربی اور حقیقی استاذ علامہ شبلیؒ تھے۔ انہیں کی سرپرستی اور نگرانی میں مولانا نے عربی اور فارسی زبان میں کمال حاصل کیا۔ زبان وادب کی تحصیل کے شوق کی تکمیل کے لیے انہوں نے باہر کے سفر کیے چنانچہ لکھنؤ اور لاہور میں قیام بھی کیا۔ اس ضمن میں انہوں نے سب سے زیادہ مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے استفادہ کیا۔ اس وقت وہ اورینٹل کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر تھے اور عربی ادب اور لغت میں پورے ملک کے اندر ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے خود علامہ شبلی نے بھی استفادہ کیا تھا۔ اس طرح علامہ شبلی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی تربیت اور سرپرستی کا یہ نتیجہ ہوا کہ مولانا کے اندر صحیح معنیٰ میں زبان وادب کا ملکہ اور عربیت کا عمدہ مذاق پیدا ہوا اور فارسی اور عربی زبان میں مضمون نگاری کے ساتھ ساتھ شاعری بھی کرنے لگے۔ چنانچہ ان کی بعض نظموں کو علامہ شبلی نے مولانا فاروق چریاکوٹی کو دکھایا تو انہوں نے نہ صرف ان کے کلام کی داد دی بلکہ فن کے استاد کی حیثیت سے تسلیم کیا۔ مولانا فراہیؒ کی زندگی کا دوسرا مرحلہ علی گڑھ آمد کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کے کھاتے پیتے گھرانوں کی نظر علی گڑھ پر پڑتی تھی۔ اور وہ جدید علوم کے حصول کا سب سے بڑا مرکز اس یونیورسٹی کو سمجھتے تھے۔ مولانا فراہیؒ کو علی گڑھ سے واقفیت اپنے استاذ اور مربی علامہ شبلی سے ہوئی تھی اور ان ہی کے اشارہ سے وہ یہاں تشریف لائے اور بی، اے کی سند حاصل کی۔ بی، اے میں مولانا کا ایک مضمون عربی بھی تھی لیکن درحقیقت مولانا عربی کے متعلم نہیں بلکہ معلم تھے۔ اس لیے انہوں نے صرف جدید علوم خاص طور سے فلسفہ اور انگریزی زبان کی طرف توجہ کی اور اس میں کمال حاصل کیا۔

علی گڑھ میں انہوں نے عبرانی زبان شعبۂ عربی کے مشہور جرمن پروفیسر یوسف ہارویز
سے حاصل کی۔ وہ عبرانی زبان کے بھی ماہر تھے۔ علی گڑھ میں مولانا انگریزی، فلسفہ اور
عبرانی زبان کے ساتھ ساتھ تصنیف و تحقیق کے ان جدید اصولوں سے بھی واقف ہوئے
جو عصری تعلیم گاہوں میں مغرب سے رابطہ کے بعد رائج ہو گئے تھے۔ اس طرح مولانا
کی ذہنی و فکری تربیت میں علی گڑھ کا بڑا ہاتھ ہے۔

مولانا فراہی کا قیام علی گڑھ میں اس لحاظ سے بہت مفید رہا کہ انہوں نے یہاں
ہر مکتب فکر کے اساتذہ اور محققین کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان کی علمی و ادبی کاوشوں سے
استفادہ کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہاں کے اکثر و بیشتر اساتذہ سرسید کی رہبری میں
کام کر رہے تھے، سرسید نے جہاں تعلیم و تربیت کے نئے اصول پیش کیے جو اس نئی
درسگاہ کے لیے مشعل راہ تھے وہیں انہوں نے زبان و بیان کے ایسے طریقے اختیار کیے
جن کی بدولت اردو نثر نگاری کا معیار بالکل بدل گیا۔ انہیں جہاں قوم و ملت کا درد تھا
اور وہ ان کو پستی کی طرف سے بلندی کی طرف اٹھانا چاہتے تھے وہاں ان کے لکھنے اور بولنے کا
انداز بھی جاذب نظر اور نرالا تھا۔ بلاشبہ انہوں نے اپنی نثر نگاری میں تکلف اور
سجع کی دیواروں کو توڑتے ہوئے ایک رواں اور سلیس انداز بیان اختیار کیا جس میں
گنگا کی گہرائی اور اس کی روانی دونوں پائی جاتی ہے۔ اس زمانے میں انہوں نے ایک طرف
اپنے رسالہ تہذیب الاخلاق اور اپنی دوسری تصنیفات میں نئے نئے موضوعات پر
لکھنا شروع کیا تو دوسری طرف قوم کی مکمل رہنمائی کی خاطر ان کے ذہن میں قرآن مجید
کی تفسیر کا خیال بھی پیدا ہوا۔ یہ خیال انہیں اس لیے ہوا کہ کلام مجید کے بہت سے مباحث
میں طرح طرح کی پیچیدگیاں پائی جاتی تھیں اور علمائے سلف کی ایک بڑی جماعت نے

ان پر جو کچھ کام کیا تھا اس کے ایک بڑے حصے کو جدید نسل قبول نہیں کر پا رہی تھی۔ خاص
طور سے قرآن مجید کا وہ حصہ جس کا تعلق علم الکلام سے ہے، سرسید نے تفسیر احمدی لکھنی شروع
کی جس میں تفسیر و تعبیر کا ایک نیا انداز اختیار کیا وہ جدید فلسفہ اور نئے علوم کو خصوصی اہمیت
دیتے تھے جن کی وجہ سے کلام پاک کے بہت سے مباحث میں نوجوان طبقہ شکوک و
شبہات میں مبتلا تھا۔ سرسید نے ان کے ذہن کی تسکین و تشفی کے لیے قدیم علماء کے
نظریات و مباحث کے ساتھ ساتھ جدید فلاسفہ و مفکرین کے افکار و خیالات کو بھی
سامنے رکھا۔ ظاہر ہے یہ سرسید کے دور کا نمایاں وصف ہے، مصر میں شیخ محمد عبدہ
اور رشید رضا نے "المنار" کے صفحات پر قرآن مجید کی تفسیر کا جو کام شروع کیا تھا وہ
بھی اسی طرح کی ایک کاوش تھی، سرسید عبدہ کی فکر اور ان کی تحریک سے پوری طرح
واقف تھے، ہندوستان میں عبدہ اور رشید رضا کے نظریات کا تعارف کرانے میں
علامہ شبلی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ سرسید کی تفسیر احمدی کو ایک طبقے نے شرف قبولیت
بخشا لیکن علماء کے ایک بہت بڑے طبقے نے اس کی شدید مخالفت کی۔ ان کے افکار
و نظریات سے خواہ کتنا ہی اختلاف کیا جائے لیکن جس انداز میں انہوں نے تفسیر کا کام
شروع کیا تھا وہ یقیناً چونکا دینے والا تھا اور ان کی وجہ سے فکر اور اجتہاد کے
دروازے کھل رہے تھے۔ جسے انیسویں صدی کی بڑی نعمت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔
مولانا فراہی گرچہ سرسید کے ان نظریات سے جو تفسیر احمدی میں موجود تھے متفق نہیں
تھے لیکن جس انداز سے سرسید اپنی بات کو پیش کر رہے تھے اور جن مباحث کو چھیڑ رہے
تھے ان سے انہوں نے پوری طرح استفادہ کیا۔

تفسیر احمدی کے علاوہ سرسید کی ایک معرکۃ الآرا کتاب "تبیین الکلام فی تفسیر

"التوراۃ والانجیل علی ملة الاسلام" بھی ہے جو ۱۸۶۲ء مطابق ۱۲۷۸ھ میں چھپی۔ اس میں سرسید نے آسمانی صحیفوں کی حقیقت پر روشنی ڈالنے کے علاوہ ان کا تاریخی جائزہ لیا ہے اور خاص طور سے توراۃ وانجیل کے مباحث پر عالمانہ بحث کی ہے انہوں نے ان دونوں کتابوں پر جو محققانہ بحث کی ہے ان کے مطالعہ کے بعد ان کتابوں کی تعلیمات سے واقفیت پیدا ہوجاتی ہے اور ان کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کے مباحث خصوصاً توحید و رسالت سے مطابقت پیدا ہوجاتی ہے۔ قرآن مجید نے توراۃ وانجیل کو آسمانی صحیفہ تسلیم کیا ہے اور اس بات کو بھی تسلیم کیا ہے کہ تمام انبیاء کی تعلیمات بنیادی طور سے ایک ہی ہیں۔ لیکن لوگوں نے توراۃ وانجیل میں اپنی ذاتی اغراض کی خاطر تحریفات کی ہیں جن کی وجہ سے اصل توراۃ کے مسائل میں خلط ملط پیدا ہوگیا ہے لیکن وہ واقعات اور مسائل جن کے متعلق قرآن مجید نے محض اشاروں پر اکتفا کیا ہے، ان کے بارے میں توراۃ وانجیل کے مطالعہ کے بعد بہت سی مفید وضاحتیں سامنے آجاتی ہیں۔ سرسید کی اس تصنیف کے مطالعہ سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن پاک کے محقق اور مفسر کی نظر اگر توراۃ وانجیل کے مسائل اور مباحث پر نہ ہو تو وہ قرآن پاک کے اندر مذکور بعض واقعات و مسائل کو سمجھ نہیں سکتا ہے۔ گویا سرسید نے اس نئے دور میں اس نکتے کی طرف علماء کی رہبری کی کہ اسلام کا تقابلی مطالعہ اور قرآن مجید کی صحیح تفہیم آسمانی کتابوں سے مکمل واقفیت کے بغیر ممکن نہیں۔ مولانا فراہیؒ نے قرآن مجید کی بہت سی سورتوں کی جو تفسیریں کی ہیں اور قرآن مجید پر ان کے جو نوٹس ہیں ان کے پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا فراہیؒ بھی اس بات کے پوری طرح قائل تھے کہ کلام مجید کی تفسیر کے میدان میں قدم رکھنے سے پہلے عربی زبان وادب سے واقفیت

کے ساتھ ساتھ دوسری آسمانی کتابوں سے واقفیت ضروری ہے چنانچہ اس مقصد کی خاطر انہوں نے علی گڑھ کے دوران قیام عبرانی زبان سیکھی اور اپنی زندگی کے ہر مرحلہ میں اس زبان سے واقفیت کی بدولت قرآن پاک کے افہام وتفہیم میں کامیاب رہے۔ وہ خاص طور سے جب کلام مجید کا درس دیتے تو توراۃ بھی ان کے پیش نظر رہتی۔ اس اعتبار سے مولانا کا علی گڑھ کا قیام ان کے علمی و تصنیفی کام میں بہت بڑا محرک ثابت ہوا۔ چنانچہ انہوں نے خود اپنی تفسیر نظام القرآن کے مقدمے میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کلام مجید کی تفسیر کا خاکہ انہوں نے علی گڑھ کے قیام کے دوران مرتب کیا تھا۔

مولانا فراہیؒ کی زندگی کا تیسرا مرحلہ بحیثیت معلم درس و تدریس شروع ہوتا ہے۔ انہوں نے کراچی کا پہلا سفر کیا جہاں وہ عربی کے استاذ کی حیثیت سے گئے تھے، اس کے کچھ دنوں کے بعد پھر علی گڑھ واپسی ہوئی۔ یہاں بھی عربی کے استاد مقرر کیے گئے، یہ وہ زمانہ تھا جب سرسید اپنی تفسیر "تفسیر احمدی" کی تصنیف و تالیف میں مشغول تھے، سرسید کے کچھ ہمنواؤں نے مولانا فراہی سے اس تفسیر کو عربی میں ترجمہ کرنے کے لیے کہا۔ مولانا سرسید کے بڑے قدرداں تھے لیکن جن چیزوں سے انہیں اختلاف ہوتا تھا انکا صاف صاف انکار کر دیتے تھے۔ تفسیر احمدی بھی ان کی نظر میں لغو تفسیر تھی اس لیے عربی زبان میں اس کا ترجمہ کرنے سے انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

علی گڑھ کے بعد مولانا کچھ دنوں الہ آباد یونیورسٹی اور اس کے بعد حیدرآباد میں دارالعلوم کے پرنسپل مقرر کیے گئے۔ دارالعلوم اس وقت حیدرآباد کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ تھا وہاں مولانا نے اس ادارہ کی اپنی بساط کے مطابق خدمت کی۔

چوتھا مرحلہ مولانا کے حیدرآباد چھوڑنے کے بعد مدرسۃ الاصلاح پر قیام کے بعد

سے شروع ہوتا ہے۔ مدرستہ الاصلاح کا قیام مولانا کے علمی سفر کے لیے سب سے زیادہ معاون اور سازگار رہا۔ مدرستہ الاصلاح اگرچہ ایک گاؤں میں واقع ہے، جہاں شہروں کی طرح سہولیات زندگی میسر نہیں تھیں اور نہ مدرسہ کے کتب خانہ میں مختلف موضوعات کی اہم کتب موجود رہی ہوں گی۔ اس لیے بلاشبہ ان کا سب سے بڑا سرمایہ ان کی ذاتی کتابیں رہی ہوں گی۔ مولانا کو کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا انہوں نے مختلف موضوعات پر جو وقیع تصانیف بطور یادگار چھوڑی ہیں، انہیں دیکھنے سے ان کے مطالعہ کی ہمہ گیری اور وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کی پہلی کتاب "جمہرۃ البلاغۃ" کو جو کراچی کے دوران قیام لکھی تھی پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ اس وقت تک کتنا وسیع ہو چکا تھا۔ مولانا کا جو تصنیفی اور تالیفی عمل ہے، اسے دیکھ کر بآسانی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کا مرکزی موضوع ہمیشہ قرآن ہی رہا ہے۔ وہ علوم جو قرآن فہمی کے لیے ضروری تھے مولانا ان کو بھی اہمیت دیتے تھے۔ مثلاً ادب خاص طور سے جاہلی دور کا ادب وشاعری لغت، اعجاز القرآن، بلاغت، نقد اور نحو وصرف۔ یہ وہ موضوعات ہیں جن پر مکمل گرفت کے بغیر قرآن فہمی کا صحیح ذوق پیدا نہیں ہو سکتا، مولانا فراہی ان علوم کی اہمیت کے معترف تھے اور انہیں ان کا مقام عطا کرتے تھے۔

قرآن مجید کے سمجھنے کے دو زاویے

قرآن مجید کے سمجھنے کے دو زاویے ہیں۔ ایک اسکی اندرونی کیفیت اور دوسرے اس کی ظاہری کیفیت۔ ظاہری کیفیت میں جو حقائق ہیں وہ خارجی مطالعہ سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ مثلاً قصص، قرآن کا جغرافیہ مقامات کی تعیین، احکام، اخلاقیات سے متعلق آیات وغیرہ یقیناً یہ چیزیں تفسیر،

فقہ، حدیث، تاریخ اور سیرت کی کتابوں کے مطالعہ سے آسکتی ہیں۔ لیکن قرآن کی جو اندرونی کیفیت ہے یعنی اس کا اعجاز، آیات کا ربط، معانی کا تسلسل، اس کی عظمت وشوکت، ان سب کا ادراک واحساس صرف قرآن مجید سے غیر معمولی انہماک سے ہی ہو سکتا ہے اور اس میں انسان کے خارجی مطالعہ کا بالکل دخل نہیں ہے۔ قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا (یوسف- ۱۲: ۲)

بے شک ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اتارا۔

اور جس زمانے میں قرآن مجید نازل ہوا اور جن لوگوں کے درمیان نازل ہوا ان کے پاس دنیا کے آرام وآسایش کے وسائل وذرائع بالکل نہیں تھے لیکن زبان کے معاملہ میں وہ خود کو سب سے زیادہ ترقی یافتہ سمجھتے تھے۔ عربی زبان کے اندر حد سے زیادہ وسعت اور لچک ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس زبان کو اپنی آخری کتاب کی زبان مقرر کیا۔ وہ عرب جن کے درمیان قرآن مجید نازل ہوا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایمان داری، شرافت، شجاعت، اقربا نوازی، غریبوں کی غمگساری الغرض ان کی تمام خوبیوں کے معترف تھے لیکن وہ مذہب اور جن عادات وتقالید کے درمیان پیدا ہوئے تھے اس کو چھوڑنے کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ ان کا مذہب جو بھی رہا ہو ان کی عادات وتقالید جو بھی رہی ہوں، ان کی سماجی زندگی کیسی بھی رہی ہو لیکن وہ انکی اتباع اور تقلید کو اپنے لیے لازم سمجھتے تھے۔

أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا (ہود- ۱۱: ۸۷)

کہ ہم ان چیزوں کو چھوڑ دیں جن کو ہمارے باپ دادا پرستش کرتے آئے۔

دوسری جگہ فرمایا:

إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّقْتَدُونَ۔ (زخرف ۴۳: ۲۳)

بے شک ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم انھی کے نقش قدم پر چلتے رہیں گے۔

بہرکیف وہ جو زندگی بسر کر رہے تھے اس پر راضی اور قانع تھے اور اس میں مخلص بھی تھے، ان میں تصنع نہیں تھا۔ چنانچہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے بڑی شرافت سے آپ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے یہ کہا کہ آپ دنیا کی جو چیز مانگیں ہم آپ کو دے سکتے ہیں، کسی اچھے خاندان کی لڑکی سے شادی کر سکتے ہیں آپ کو اپنا سردار تسلیم کر سکتے ہیں، لیکن جو ہمارا مذہب ہے، جو ہماری تقالید ہیں اس پر ہم کسی طرح سے سودہ بازی نہیں کر سکتے ہیں، جس کے جواب میں آپ نے فرمایا تھا کہ اگر ایک ہاتھ میں سورج اور اگر ایک ہاتھ میں چاند بھی رکھ دو تو میں اسلام کی اشاعت سے باز نہیں رہوں گا۔ اس لیے اگر معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف ذاتی اوصاف و خصائل ہی پر منحصر ہوتا تو ایک فرد بھی آپ کے کہنے پر اپنا مذہب تبدیل نہیں کرتا اور نبوت کا مسئلہ آپ کی ذات تک ہی محدود رہ جاتا۔ چنانچہ تاریخ میں بہت سے ایسے انبیاء کا ذکر ہے جو زندگی بھر اپنی قوم کو خدا کی طرف بلاتے رہے لیکن چند ہی لوگوں نے ان کی دعوت کو قبول کیا۔ اس کے برعکس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تیئیس ۲۳ سالہ زندگی میں جزیرۃ العرب میں شاید ہی کوئی ایسا بچا ہو جس نے آپ کی نبوت کو تسلیم نہ کیا ہو۔ اس کا سب سے بڑا سبب میری حقیر رائے میں یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت کو قرآن مجید سے مربوط کر دیا تھا اور قرآن پاک کو عربی زبان سے۔ یہ تینوں چیزیں ایک دوسرے سے اتنی مربوط ہو گئیں کہ ان کے بغیر اسلام کا وجود بے معنیٰ ہو گیا۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (حجر ۱۵: ۹)

بے شک ہم نے (یہ) یاددہانی اتاری ہے اور بے شک ہم اس کے محافظ ہیں۔

آیت کریمہ میں ذکر سے مراد قرآن ہے اور حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید جس زبان میں، جس طریقے اور جس ترتیب سے نازل ہوا اس میں ذرہ برابر کمی یا تبدیلی نہیں ہوگی نہ لفظ میں نہ معنیٰ میں۔ کیونکہ یہ لفظ و معنیٰ دونوں سے مربوط ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۔ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۔ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۔ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۔ (قیامہ ۷۵: ۱۶-۱۹)

اس کو جلدی سیکھ لینے کے لیے اس کے پڑھنے پر اپنی زبان کو جلدی نہ چلاؤ، ہمارے ذمہ ہے اسکو جمع کرنا اور اسکو سنانا تو جب ہم اسکو سنا چکیں تو اس سنانے کی پیروی کرو پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اسکی وضاحت کرنا۔

گویا قرآن کا وجود عربی زبان سے مربوط ہے، اس زبان نے قرآن کی عظمت کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔ عربوں کے بارے میں معلوم ہے کہ انہیں زبان کا صحیح ملکہ حاصل تھا۔ وہ اس کی عظمت، فصاحت و بلاغت اور وسعت و لچک سے پوری طرح واقف تھے، زبان سے انہیں اتنا لگاؤ تھا کہ ان کے قومی میلوں میں ادبی مقابلے ہوتے تھے۔ چنانچہ سوق عکاظ میں مختلف قبائل کے شعرا اپنا کلام سناتے تھے اور قوم بڑی تعداد میں ان کا کلام سنتی تھی، ان کے درمیان جو زبان کے ماہرین تھے وہ محاکمہ کے لیے مقرر ہوتے تھے ان کا فیصلہ سب کے لیے حرف آخر ہوتا تھا۔ سوق عکاظ کے شعری مقابلوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عربوں کو ادب و شاعری سے بیحد لگاؤ تھا۔ چنانچہ اہل عرب جب

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے متعارف ہوئے اور اس کی تائید میں کلام الٰہی کو سُنا تو وہ چکرا گئے۔ کچھ عرصہ تک انکار کرتے رہے۔ ان کا انکار بھی زبانی تھا۔ اندر سے وہ بالکل مطمئن تھے اسی لیے وہ ذہنی اور نفسیاتی کشمکش کا شکار تھے۔ وہ اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ کلام پاک سے جتنا ہو سکے دور رہیں یہاں تک کہ اپنے بچوں اور عورتوں کو بھی کلام پاک سننے سے منع کرتے اگر کہیں ان کا کسی ایسی جگہ سے گذر ہو جاتا جہاں کلام مجید کی تلاوت ہو رہی ہوتی تو وہ اس بات کی کوشش کرتے کہ اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں اور شور مچائیں چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا	اور کفر کرنے والوں نے کہا کہ اس قرآن
لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ	کو نہ سنو اور اس کے بیچ میں شور و شغب
لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (فصلت ۴۱: ۲۶)	برپا کرو تاکہ تم غالب رہو۔

اس طرح وہ اپنی اندرونی کشمکش بلکہ اپنے اندرونی احساس سے بغاوت کا اعلان کرتے تھے گویا یہ اس بات کا کھلا اعتراف تھا کہ قرآن پاک کی ہر فکر، اس کا ہر ساز، اس کا ہر نغمہ اور اس کی ہر کیفیت اور جملوں کا ربط و تسلسل اس وقت کے انسان کے کلام سے یکسر مختلف تھا۔ کہیں پر کوئی ربط و مماثلت نہیں۔ عربوں کے سامنے جو عربی زبان تھی وہ اپنی تمام تر عظمتوں کے باوجود کلام پاک کے سامنے بالکل ہیچ تھی۔ کلام پاک کے سامنے اپنی زبان کی بے بضاعتی ہی کا اعتراف تھا کہ وہ بول اٹھے :

اِنْ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ	یہ تو محض ایک جادو ہے جو پہلے سے
(مدثر ۷۴: ۲۴)	چلا آ رہا ہے۔

سحر سے مطلب قرآن کا اثر اور دلوں کو ہلا دینے والی کیفیت ہے بلکہ ذہن کو

موڑنے والی وہ طاقت ہے کہ جو اسے سُنتا وہ چکرا کے سُنانے والے کے قدموں میں پڑ جاتا۔ اگر حضرت موسیٰؑ کے سحر کے سامنے اس وقت کے تمام جادوگر سربسجود ہو گئے تھے اور فرعون کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے تھے تو یہاں یہ کہنا پڑے گا کہ قرآن کے جادو اور اسکے اثر کے سامنے تمام انس و جن سربسجود ہو گئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ	کہدو مجھے وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک
مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا	جماعت نے قرآن کو سُنا تو انھوں نے اپنی
عَجَبًا۔ يَّهْدِيْ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا	قوم کو بتایا کہ ہم نے ایک بہت دل پذیر
بِهٖ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَا اَحَدًا۔	قرآن سُنا جو ہدایت کی راہ بتاتا ہے تو
(جن ۷۲: ۱ و ۲)	ہم اس پر ایمان لائے اور اب ہم ہرگز کسی کو اپنے رب کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے

بلاشبہ کلام مجید کا اثر عربوں کے ذہن و فکر پر اس طرح مرتب ہوا تھا کہ وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ یہ انسان کا کلام نہیں ہے اور یہی اعتراف ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے اعتراف کی طرف لے گیا۔ وہ جب ایمان لائے تو ان کا ذہن کلام مجید کے اندر مذکور تمام حقایق پر پوری طرح مطمئن تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ پورا قرآن مجید ایک وحدت ہے اور اس کا ہر مسئلہ خدا کا حکم ہے۔ اس لیے اس سے مستنبط تمام مسائل پر ایمان لانا واجب اور ضروری ہے۔ قرآن کے حقایق کے سلسلے میں شک و شبے کا دور اس وقت شروع ہوتا ہے جب اسلام کے دائرہ میں وہ قومیں آئیں جن کی مادری زبان عربی نہیں تھی اور جن کا مذہب، کلچر، تہذیب، عربوں کی تہذیب و تمدن سے قطعاً مختلف تھی۔ چنانچہ وہ قرآن کو اپنے قدیم مذہب، قدیم تہذیب اور قدیم معاشرت کی

روشنی میں دیکھتے اور جو چیز ان کے قدیم مذہب وتہذیب سے تال میل نہ کھاتی اس کے بارے میں شکوک میں مبتلا ہو جاتے، لیکن جہاں تک عربوں کا معاملہ تھا وہ اسلام کو قبول کرتے ہی قرآن مجید سے عشق ومحبت کے ساتھ ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی عاشق وشیدائی بن گئے اور دونوں کی اطاعت وفرمانبرداری کو اپنی زندگی کا جزو سمجھنے لگے، وہ کلام مجید کو سنتے تو اپنے ذاتی وجدان اور اپنی زبان پر غیر معمولی قدرت کی وجہ سے فوراً اس کے ظاہری الفاظ سے لے کر اس کے معنیٰ کی تہوں میں پہونچ جاتے اور اسکے الفاظ وتراکیب کی لہروں میں موجود طاقت کو محسوس کر لیتے۔ اس وقت کہیں سے بھی یہ آواز نہیں اٹھی کہ کلام پاک کا اعجاز کیا ہے؟ بلکہ مجموعی طور سے سب کے ذہن و فکر میں یہ بات تھی کہ یہ کلام الٰہی ہے اور اس کا ہر حرف اور ہر جزء اپنی جگہ پر معجزہ ہے اور اس کے حرف ولفظ اور ترکیب ومعنیٰ کا موازنہ کلام انسانی سے کرنا فعل عبث ہے۔ وہ اس پھیلی ہوئی کائنات کو دیکھتے جس میں لاکھوں چیزیں موجود ہیں، انہیں ہر چیز اپنی جگہ پر معجزہ نظر آتی، جس کی نقل انسان کے لیے خواہ وہ کتنی ہی کوشش کرے، ممکن نہیں تھی:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ
وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ
لِأُولِي الْأَلْبَابِ۔ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ
اللّٰهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلٰى جُنُوبِهِمْ
وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ
وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا

بے شک آسمانوں اور زمین کی خلقت
میں اور رات اور دن کی آمد وشد میں
اہل عقل کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں
ان کے لیے جو کھڑے بیٹھے اور اپنے
پہلوؤں پر خدا کو یاد کرتے رہتے ہیں
اور آسمانوں اور زمین کی خلقت پر غور

بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ
(آل عمران ۳: ۱۹۰-۱۹۱)

کرتے رہتے ہیں (ان کی دعا یہ ہوتی ہے)
کہ اے ہمارے خداوند تونے یہ کارخانہ
بے مقصد نہیں پیدا کیا ہے تو (عبث کام
کرنے سے) پاک ہے، سو تو ہمیں دوزخ
کی آگ سے بچا

گویا اس کائنات میں جو چیز بھی اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے وہ بے کار اور بے ضرورت نہیں، گلاب کا پھول کانٹوں میں نکلتا ہے اور اپنے حسن وجمال سے انسان کے لیے روح بخش ثابت ہوتا ہے۔ پتھروں میں چھپے ہوئے جواہرات انسان کے تخت وتاج کی زینت بنتے ہیں، کوئی یہ کہے کہ گلاب کے پھول کے لیے کانٹے کیوں اور چمکتے ہوئے ہیرے کے لیے یہ پہاڑ کی چٹانیں کیوں؟ جس طرح سے کائنات کا ہر ذرہ اپنی جگہ پر اہم اور ضروری ہے اسی طرح کلام مجید کا ہر حرف ولفظ اور ہر آیت اپنی جگہ پر مربوط ہے۔ اسے کہیں سے بھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔ لفظ جملہ سے مربوط ہے اور جملہ اپنے سابقہ جملہ سے مربوط ہے اس طرح لفظ وجملہ کے ربط وتسلسل میں فکر ومعنیٰ کا تسلسل بھی ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ معنیٰ اور فکر کے تسلسل سے ہی لفظ اور جملہ کا تسلسل بنتا ہے اور ربط قائم ہوتا ہے۔ متقدمین مفسرین سے لے کر متاخرین مفسرین تک نے قرآن مجید کی جو تفسیریں لکھی ہیں ان میں ایک آیت کا ربط دوسری آیت سے اور اسی طرح پوری سورہ کے مضامین میں ایک طرح کے ربط اور تسلسل کا اعتراف تو ملتا ہے لیکن جہاں تک ایک سورہ کا ربط دوسری سورہ سے ہے اس سلسلہ میں علماء اور مفسرین کی رائیں الگ الگ ہو گئی ہیں۔ ایک جماعت ہر سورہ کو ایک وحدت سے تعبیر کرتی ہے تو دوسری جماعت ہر سورہ کو

دوسری سورہ سے مربوط قرار دیتی ہے۔ میری حقیر رائے میں یہ سب لفظی بحثیں ہیں کیونکہ
نظام قرآن کے اصول وضوابط کو دوسرے علوم کے اصول وضوابط کی طرح مرتب نہیں
کیا جا سکتا اس لیے تصور نظم کو اصول وضوابط کے ذریعہ نہ تو پیش کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی
ان کے ذریعہ اس کا ادراک کیا جا سکتا ہے بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ اس میں کلام پاک پڑھنے
والے کی وجدانی کیفیت، زبان وبیان پر اس کی غیر معمولی گرفت، فن وبیان سے گہرا لگاؤ
اور زبان کی نوک پلک سے پوری واقفیت کا بہت زیادہ دخل ہے۔ چنانچہ جن لوگوں
کو یہ ملکہ حاصل نہیں ہے وہ کتنی ہی کوشش کریں کلام مجید کے نظام کو یا اس کے اعجاز واسرار
کو نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ دوسروں کے بتائے ہوئے اشاروں یا دوسروں کے اقوال کی روشنی
میں کلام پاک کی اندرونی کیفیت کا احساس پیدا نہیں کیا جا سکتا جو علماء و مفسرین نظام
قرآن کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے پیش نظر فی الواقع اس علم کا یہی پہلو ہوتا ہے وہ قرآن مجید
سے متعلق ان مباحث پر توجہ دیتے ہیں جو محنت و مطالعہ سے حاصل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ
مولانا فراہیؒ نے جہاں منکرین نظام قرآن کا ذکر کیا ہے اور انکار نظم قرآن کے بہت
سے اسباب بتائے ہیں ان میں یہ بھی کہا ہے کہ جو علماء کلام پاک کی تہوں میں جانا نہیں چاہتے
اور اس کے اسرار و رموز سے واقفیت نہیں حاصل کرنا چاہتے وہ نظام قرآن کے مسئلہ کو
نظر انداز کر کے کلام پاک کے ان مسائل کی جانب متوجہ ہو جاتے ہیں جن کا سمجھنا آسان
ہے۔ مثلاً کلام پاک میں تزکیہ نفس کے مسائل، اخلاقیات کے مسائل، احکام کے مسائل،
قصص کے مسائل، مقامات کی تعیین کے مسائل وغیرہ ہیں۔ یہ وہ مسائل ہیں جن تک
محنت اور کاوش کے بعد پہنچا جا سکتا ہے۔ سہولت پسند طبقہ ان ہی مسائل پر توجہ دیتا ہے۔
اور نظم قرآن کے بارے میں بڑی آسانی سے یہ کہہ دیتا ہے کہ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کے

بارے میں اتنی کاوش اور محنت کی جائے اور نہ ہی یہ فہم قرآن کے سلسلے میں زیادہ معاون
اور موثر ہے اس کے برعکس وہ علماء جو نظام قرآن کے قائل ہیں وہ اسے اصل اور مرکزی
موضوع تصور کرتے ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ نظام قرآن کے سمجھنے کے بعد دوسرے
مسائل کا سمجھنا آسان ہوگا، کیونکہ بہت سے مسائل جو مختلف اسالیب سے قرآن میں
بار بار ذکر ہوئے ہیں مثلاً حکایات امم، تزکیہ نفس، تخلیق کائنات، ذات وصفات باری
تعالیٰ وغیرہ سے متعلق مسائل، اگر نظام قرآن کا اعتراف کر کے اس کی مدد سے انہیں سمجھنے
کی کوشش کی جائے تو معاملہ بے حد آسان ہوگا کیونکہ اس طرح مربوط و مرتب شکل میں
قاری کے سامنے آجائیں گے۔ چنانچہ مولانا فراہیؒ کا کہنا ہے کہ "اگر نظام قرآن پر ہمارے
مفسرین پوری توجہ دیتے تو تاریخ اسلام میں جو فرقے پیدا ہوئے ہیں اور کلام پاک کی
آیات کی جن لوگوں نے بے جا تاویلیں کی ہیں وہ کبھی اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب نہ
ہوتے اور قرآن کے حقائق آئینہ کی طرح لوگوں کے سامنے ہوتے"۔ اس سلسلہ میں کبھی کبھی
مولانا کے یہاں تشدد کا بھی احساس ہوتا ہے اور میرے خیال میں مولانا اس معاملے میں
معذور ہیں۔ کیونکہ جس چیز کو کوئی شخص مطالعہ وانہماک کے بعد حاصل کرے اور وہ
چیز اس کے سامنے آئینہ کی طرح واضح ہو اس کے انکار یا اس سے انحراف کو وہ ہرگز برداشت
نہیں کر سکے گا۔ مثلاً کسی نے آم کا مزہ چکھا ہو اور اس کی حلاوت سے واقف ہو، اسکے
سامنے کوئی دوسرا شخص آم کی حلاوت یا اس کی لذت کا انکار کرے تو اس کی لذت و
حلاوت سے واقف شخص اسے کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ مولانا فراہیؒ کے یہاں تشدد
کی جو کیفیت پیدا ہوئی اس کی بنیاد بھی یہی ہے کیونکہ مولانا نے جب سے عربی زبان کی
تعلیم حاصل کی اور ان موضوعات کا مطالعہ کیا جن سے فہم قرآن میں مدد ملتی ہو اسکے

بعد سے لے کر اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک قرآن مجید ہی کو اپنا مرکزی موضوع بنایا اور جو کچھ لکھا پڑھا اس کا یہی دائرہ رہا۔ نظام قرآن کے سلسلہ میں جیسا کہ مولانا فراہیؒ خود فرماتے ہیں بہت سے متقدمین علماء نے بھی بحثیں کی تھیں خاص طور سے امام رازیؒ، بقاعی، رمانی اور زمخشری نے۔ یہ وہ علماء ہیں جن کی قرآن مجید کے موضوعات اور قرآنی علوم پر گہری نظر تھی۔ مولانا نے ان علماء کی کوششوں کو سراہا ہے اور ان سے استفادہ بھی کیا ہے لیکن مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے اور ان کی فکر کی سب سے زیادہ اہمیت اس لیے ہے کہ انھوں نے دیار عجم میں قرآن مجید کو اپنے فکر و مطالعہ کا مرکزی موضوع بنایا، یہ شرف علمائے عرب میں سے بھی بہت کم لوگوں کو حاصل ہے تو علمائے عجم کی اس کی طرف کیسے توجہ ہوتی ؛ مولانا کی فکر اس لحاظ سے اس زمانہ کے لیے چیلنج کا مقام رکھتی ہے۔ مولانا کے فضل و کمال اور تبحر کو دیکھکر یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انسان کو اگر خدا نے ذوق عطا فرمایا ہو اور اس کے اندر قدرت کے پھیلے ہوئے نظام سے دلچسپی رکھی ہو تو وہ کلام الٰہی کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اگر اسے عربی زبان۔ خاص طور سے نزول قرآن کے وقت کی زبان۔ سے گہری واقفیت ہو اور وہ فکر و فن کے تقاضوں کو برت لیتا ہو تو کچھ بعید نہیں کہ وہ عرب کے علماء کو پیچھے چھوڑ دے گرچہ اس کی پیدائش عجم کی کسی دور افتادہ اور عدم موافق سرزمین ہی میں کیوں نہ ہوئی ہو۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کے مفکر اور امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے، ان کے زمانہ میں جمود و تعطل کا دور دورہ تھا لیکن انھوں نے اس کی پروا نہ کرتے ہوئے صحیح اجتہاد کی بنیاد رکھی اور اسلام کے اسرار و حقائق کو اس طرح پیش کیا جیسے علماء متقدمین میں امام غزالیؒ، امام ابن قیم اور ابن تیمیہ نے پیش کیا تھا۔ چنانچہ "حجۃ اللہ البالغۃ" کی زبان

اور انداز بیان وہی ہے جو ابن تیمیہ اور ابن قیم کا ہے۔ اس سے اسلام کا ایک معجزاتی وصف یہ سامنے آتا ہے کہ وہ کسی زمان و مکان کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ جو بھی اس کی طرف مائل ہوگا اور اس میں وقت اور صلاحیت لگائے گا، اس کے سامنے اس کے اسرار و حقائق منکشف ہوں گے۔

جس طرح شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی فکر و کاوش سے اپنے زمانہ میں امامت کا درجہ حاصل کیا اور علمائے عجم سے لے کر علمائے عرب تک نے ان کی عظمت کا اعتراف کیا، اسی طرح مولانا فراہیؒ نے قرآن مجید کے سب سے دقیق اور سب سے محنت طلب موضوع کو اپنا موضوع قرار دیا اور ثابت کیا کہ قرآن مجید کے اسرار و رموز اور علوم و فنون پر جتنا غور و فکر اور جتنی محنت و کاوش کی جائے، اس سے نئی نئی شکلوں اور نئے نئے گوشوں کا انکشاف ہوگا، جس طرح سے اس کائنات کی ہر چیز پر انسانوں نے جتنی محنت کی اور کر رہے ہیں، ہر روز ایک نئی چیز کا انکشاف ہوتا ہے، یہی معاملہ خدا کی عظمت اور قرآن مجید کی حقیقت و ماہیت کی تلاش کا بھی ہے۔ انسان ان پر جتنا غور و فکر کرے گا اس کا ایمان راسخ اور مستحکم ہوتا جائیگا۔ قرآن مجید اللہ کی مقدس کتاب ہے اسے جس زاویے سے دیکھا جائے اور پڑھا جائے اس کے رموز و حقائق کا انکشاف ضرور ہوگا۔ کیونکہ خدا کی ہر مخلوق کی صفت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ نئی رہتی ہے۔ چاند روز نکلتا ہے اور لاکھوں سال سے نکل رہا ہے۔ سورج روز نکلتا اور ڈوبتا ہے۔ زمین اپنی اس ہیئت کے ساتھ لاکھوں برس سے موجود ہے لیکن اس کی ہر چیز نئی نظر آتی ہے۔ کلام پاک کا بھی یہ اعجاز ہے کہ پہلے دن سے اس کی جو شکل تھی آج بھی وہی ہے، پہلے دن سے اسکی

جو عظمت تھی آج بھی وہی عظمت ہے۔ پہلے دن سے اس کے اعجاز بیان کی جو حیثیت تھی آج بھی اس کی وہی حیثیت ہے۔ اس لیے جب بھی اس کے فہم و ادراک کے لیے کوشش کی جائے گی تو اس کے نئے نئے حقایق و رموز کا انکشاف ہوگا۔

چنانچہ آیت :

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا۔ (ابراہیم ۱۴: ۲۴)	کیا تم نے غور نہیں کیا کس طرح تمثیل بیان فرمائی ہے اللہ نے کلمہ طیبہ کی۔ وہ ایک پاکیزہ درخت کے مانند ہے جس کی جڑ زمین میں اتری ہوئی ہے اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں وہ اپنا پھل ہر فصل میں اپنے رب کے حکم سے دیتا رہتا ہے۔

اور اس کے ماقبل و مابعد پر غور کیجئے تو یہ بات پوری طرح واضح ہو جائے گی کہ کلام الٰہی کا مقام و مرتبہ کس قدر بلند ہے اور یہ کہ اس پر جتنا غور و فکر کیا جائے گا اسی کے بقدر اسرار و رموز سے واقفیت ہوگی۔

اس گفتگو کے بعد ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ مولانا فراہیؒ نے نظم قرآن اور اس کے اصول و ضوابط کی ترتیب و تقدیم سے متعلق جو بیش بہا کارنامہ انجام دیا ہے اس کا بنیادی سبب مولانا کا قرآن مجید سے غیر معمولی شغف و انہماک اور زبان و بیان سے غیر معمولی تعلق اور لگاؤ ہے۔ اس کا تذکرہ انہوں نے خود کیا ہے اور ان کا کہنا بالکل صحیح ہے۔

۱

گجرات کے سہروردی مشائخ کی عرفانی زندگی کی ایک جھلک

سیرۃ السادات کی روشنی میں

از ڈاکٹر شریف حسین قاسمی دہلی

ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں گجرات کو ہمیشہ سے ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ اسی طرح گجرات عرفان و تصوف کی تاریخ میں بھی ایک ایسے اہم مقام پر فائز ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ گجرات کے مختلف علاقوں میں سہروردی، چشتی اور قادری دبستانِ تصوف کے جلیل القدر عرفا کا قیام رہا اور اسی وجہ سے بقول شیخ عبدالحق محدث دہلوی:

"درحقیقت در آن سرزمین بوی عشق و محبت می آید و از ویرانہای وی نور برکت و ولایت می تابد و ہنوز از این شہر از وجود اہل دلی خالی نیست و نبودہ است :

بہر زمین کہ نسیمی ز زلف او زدہ است ہنوز از سر آن بوی عشق می آید[1]

اخبار الاخیار میں انہوں نے بیشتر علمی اور محتاط رویہ اختیار کیا ہے۔ انکے بیانات عقیدت اور تعصب کی افراط و تفریط سے بڑی حد تک مبرا ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی عالم دین بھی ہیں اور عارف ربانی بھی، گجرات کے بارے میں انکا

---

[1] اخبار الاخیار، محدث دہلوی، مطبع مجتبائی : ص ۱۶۸۔

یہ بیان محض زیب داستان کے لیے نہیں۔ حج کو جاتے وقت وہ خود گجرات آئے تھے اور اس سرزمین سے عشق و محبت کی خوشبو نے انھیں سرمست کیا تھا اور اسی طرح اسکے ویرانوں کو برکت و ولایت کے نور سے انہوں نے خود جگمگاتے دیکھا تھا۔

سید برہان الدین مشہور بہ قطب عالمؒ (متوفی: ۸ ذی الحجہ ۸۵۷/ ۱۰ دسمبر ۱۴۵۳) نبیرۂ مخدوم جہانیاں سید جلال بخاری (م: چہار شنبہ ۱۰ ذی الحجہ ۷۸۵/ جنوری ۱۳۸۴) وہ معروف سہروردی عارف ہیں جو سب سے پہلے اپنے وطن سے گجرات تشریف لائے اور یہیں کے ہو رہے۔ ان کی اور ان کے اہل خاندان اور خلفا کی مساعی جمیلہ نے گجرات کو سہروردی سلسلۂ تصوف کا ایک عظیم مرکز بنا دیا۔ گجرات کے ان سہروردی مشائخ سے عوام و خواص وابستہ ہو گئے۔ احمد آباد میں قطب عالم کے صاحبزادے اور جانشین شاہ منجھن ملقب بہ شاہ عالم (متوفی: ۲۰ جمادی الآخر ۸۸۰/ ۱۸ اکتوبر ۱۴۷۵) کی خانقاہ مرجع خلائق تھی۔ یہاں شب جمعہ کو شہر کے اچھے اور برے سب لوگ زیارت کی خاطر جمع ہوتے تھے اور رات یہیں گزارتے تھے[2]۔ فارسی زبان میں سیرۃ السادات اسی سہروردی خاندان مشائخ کی روزمرہ زندگی کا دستور العمل اور ریاضت و مجاہدات کا منشور ہے اس رسالے میں بنیادی طور پر فقہی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے باوجود سیرۃ السادات سے بہرحال یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ گجرات کا یہ سہروردی خاندان کس طرح زندگی گذارتا تھا۔ ایک صبح سے دوسری صبح تک ان کی عبادات کیا تھیں، ان کے اوراد و وظائف

---

[1] علی محمد خاں کے بقول حضرت قطب العالم سید برہان الدین ابو محمد عبداللہ بخاری بن سید ناصر الدین محمود بن سید الاقطاب مخدوم جہانیاں بخاری کا شجرہ سید جعفر مثنی برادر حضرت امام حسن عسکری پر منتہی ہوتا ہے۔ مرأت احمدی، بڑودہ ۱۹۲۸، لاحقہ، ص ۲۶ [2] اخبار الاخیار، ص ۱۶۷۔

کیا تھے۔ عبادات و ریاضات کے لیے یہ عارفین کرام کس قسم کے اہتمام کرتے تھے۔ ان کی تعلیمات کیا تھیں اور ایک بہتر اسلامی اور انسانی سماج کی تشکیل کے لیے وہ کس نہج پر جد و جہد کر رہے تھے۔

سیرۃ السادات ۵۳ صفحات پر مشتمل جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، بنیادی طور پر مذہبی و عرفانی نوعیت کا ایک مختصر رسالہ ہے جسے اسی خاندان کے سید محمد مقبول عالمؒ ابن سید جلال ماہ عالم نے تالیف کیا ہے۔ سید جلال ماہ عالم ۶ ذیقعدہ ۹۵۹ کو پیدا ہوئے انکو اس سلسلۂ تصوف کا مجدد کہا جاتا ہے۔ یہ اکبر بادشاہ کے معاصر ہیں۔ علی محمد خان نے انکے بارے میں لکھا ہے کہ:

"ذاتِ متبرکۂ ایشاں بعد مرور زمان واسطۂ انتظام و رابطہ و التیام سلسلۂ عالیہ شاہیہ و باعثِ رونقِ این خانوادہ شدہ و بعد انقلاب بسیار سال تسخیر اکبر بادشاہ شہر آباد را بہ سعی خان اعظم نایب شہر سجادگی آستانۂ علیہ شاہیہ بر ایشان مقرر شدہ"[2]

سیرۃ السادات کے مصنف سید محمد مقبول ۲۴ رجب ۹۸۹ھ/ ۱۵۸۱ء کو پیدا ہوئے ان کی بعض کتابوں کا علم ہے جن میں سات جلدوں میں جمعات شاہی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ان کی وفات ۱۲ رجب ۱۰۴۵/ ۳۶-۱۶۳۵ کو ہوئی۔ سید محمد مقبول عالم کے لڑکے سید جلال مقصود عالم کو شاہجہاں نے منصب صدارت پر فائز کیا تھا۔ وہ لاہور میں ۲۰ ربیع الثانی ۱۰۵۹/ ۱۶۴۹ میں فوت ہوئے، لیکن تدفین رسول آباد میں کی گئی۔

---

[1] نیشنل آرکائیوز کی فہرست مخطوطات کے مرتب نے اسکے مصنف کا نام محمد حیات ابن ملک عبد الواحد درج کیا ہے، جو صحیح نہیں۔ جیسا کہ اس رسالے کے ترقیمے سے واضح ہوتا ہے، محمد حیات اس رسالے کے کاتب ہیں، مصنف نہیں [2] مرأۃ احمدی، ص ۴۰۔

سیرۃ السادات کے پہلے صفحے کی یہ عبارت کہ "الجزء الاول من رسالہ" اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ یہ رسالے کا پہلا حصہ ہے اور مصنف غالباً اس کا دوسرا حصہ بھی ترتیب دینا چاہتا تھا جس کے بارے میں فی الحال کوئی اطلاع نہیں۔ اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ نیشنل آرکائیوز، نئی دہلی میں (شمارہ ۲۵۴۳) موجود ہے۔ راقم نے فارسی مخطوطات کی متعدد فہرستوں پر نگاہ ڈالی لیکن اس رسالے کے کسی دوسرے نسخے کا پتا نہیں چل سکا ہاں ایک نسخہ پیر محمد شاہ لائبریری میں موجود ہے۔ آرکائیوز کے مخطوطے پر پہلے ہی صفحہ پر یہ عبارت درج ہے:

"مالکہ مملوک اہل بیت النبوی علی اصغر بن جلال بن محمد شاہی الرضوی"[1]

اس عبارت سے واضح ہوتاہے کہ سیرۃ السادات کا یہ نسخہ اسی خانوادہ کے ایک فرد علی اصغر بن جلال بن محمد الشاہی الرضوی کی تحویل میں رہاہے۔

اس مخطوطے پر ترقیمہ بھی نہایت اہم ہے جس سے پتا چلتاہے کہ اس رسالے کے کاتب کا نام محمد حیات منجھن شاہی ابن ملک عبدالواحد ہے جو اسی خانوادۂ تصوف سے منسلک اور اسی کے مرید تھے۔ انہوں نے اس رسالے کی کتابت رمضان کی دسویں تاریخ جمعہ کی نماز کے وقت ۱۱۳۱ھ میں مکمل کی د ترقیمے کی مکمل عبارت درج ذیل ہے:

"بتاریخ دہم رمضان المبارک روز جمعہ وقت نماز جمعہ در ۱۱۳۱ یکہزار و یک صد وسی و یک ہجری از تحریر این رسالہ مفیدۃ المقالہ سعادۃ ابدی اندوخت"

[1] مصنف رسالہ سے علی اصغر کا تعلق درج ذیل تھا: سید علی اصغر بن سید جلال بن سید محمد محبوب عالم بن سید جعفر بدر عالم بن سید جلال مقصود عالم (صدر الصدور) بن سید محمد مقبول عالم بن سید جلال ماہ عالم۔

کمترین مریدان و خاکروبان درگاہ شاہی اضعف عباد الہی ابن ملک عبدالواحد محمد حیات منجھن شاہی"

جیسا کہ ترقیمے سے معلوم ہوتاہے اس رسالے کی کتابت ۱۱۳۱ھ (۱۹-۱۷۱۸ء) میں ہوئی اور رسالے کے مصنف کا انتقال ۱۰۴۵ھ (۳۶-۱۶۳۵ء) میں ہوا تھا۔ اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ رسالے کا یہ مخطوطہ مصنف کی وفات کے ۸۶ برس بعد کتابت کیا گیاہے۔

رسالے کے اس مخطوطے کے حاشیوں پر بعض عبارتوں کا اضافہ کیا گیاہے اور حاشیے ہی پر متن میں وارد بعض الفاظ کے املا کی تصحیح بھی کی گئی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ مخطوطہ کسی صاحب علم و عرفان کی نظر سے گذرا ہے۔

خوش خط نستعلیق میں سیرۃ السادات کا یہ قلمی نسخہ عربی کی اس عبارت سے شروع ہوتاہے:

"الحمد للہ النعام ذی الجلال والاکرام الذی حمدۃ سیرۃ السادات والصلوۃ والسلام علی عبدہ سید العالمین وآلہ واھل بیتہ الذین صلوتھم"[1]

مصنف کے بقول اس رسالے میں جو کچھ درج ہے وہ "پسر از پدر دیدہ و ولد از والد شنیدہ" اور ان سب مطالب کی بنیاد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی روایات پر ہے اور انہی روایات کی اطاعت و پیروی زندگی گزارنے کا صحیح راستہ اور نجات و قرب الہٰی کے حصول کا واحد طریقہ ہے۔ مصنف نے اپنے ہر قول اور

[1] معارف: عربی عبارت غلط اور بے معنی سی ہے۔

نظریے کی تصدیق وتائید میں قرآن حکیم کی آیات، احادیث اور روایات پیغمبر اسلام اور خود اپنے بزرگوں کے اقوال سے استناد کیا ہے۔ رسالے کے آغاز ہی میں مصنف نے اپنے خاندان کا منظوم شجرہ دیا ہے جو پیغمبر اسلام سے شروع ہو کر مصنف تک اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم، شاہ وصی، سید (کرم خوردہ) امام باقر، امام جعفر صادق، امام کاظم، شاہ خراسان، شاہ تقی، شاہ نقی، جعفر ثانی، علی، سید عبداللہ، احمد، سید محمود، محمد، جعفر، علی، جلال، حضرت سید کبیر دین احمد، مخدوم قبلۂ احرار جلال ملت ودین، ناصر دین محمدی محمود، سلطان عاشقان برہان (کہ یازدہ پسرش قطب بودند)، محمد مخاطب بہ شاہ عالم، سید محمد راجو، سید احمد شہید، سید عبدالغفور، سید خان، سید من جلالِ ملت ودین ماہ عالم انوار، محمد (یعنی محمد مقبول عالم مصنف رسالۂ ہذا)

اس منظوم شجرہ کے آخری چند بیت درج ذیل ہیں:

از و بہ سید خان واز و بہ سید من	جلال ملۃ ودین ماہ عالم انوار
از و بہ کلب درعلم، کاتب سیرۃ	محمد انقذہ اللہ من عذاب النار
کمینہ چون سگ اصحاب کہف این یتیم	ببخش جرم مرا یا غفور یا غفار
بحق سلسلۂ شیر حق علی ولی	کہ گر دنم تو بدین سلسلہ مشرف دار

ظاہر ہے یہ شجرہ خود مصنف نے نظم کیا ہے جو فارسی شاعری میں اسکی مہارت کا ثبوت ہے۔

مذہبی اور عرفانی نوعیت کے اس رسالے میں سیرت کے عنوان سے مختلف

موضوعات سے بحث کی گئی ہے۔ ہر سیرت ایک خاص موضوع کے لیے وقف ہے۔

پہلی سیرت کے تحت وضو اور اس کے مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ مصنف نے بتایا ہے کہ اس کے خاندان کے عرفانے وضو میں کیا روش اختیار کی ہے۔ اس خاندان کے حضرات بابرکات نے ہر نماز کے لیے وضو کی تجدید کی، کبھی ایسا بھی کیا کہ ایک ہی وضو سے چند فرائض نماز ادا کیے۔ وضو کے لیے کم سے کم پانی استعمال کیا جاتا تھا اور زیادہ پانی بہانے سے منع کیا جاتا تھا۔ وضو کے سلسلے میں مصنف نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت بیان کی ہے:

آپؐ نے فرمایا کہ میری امت میں بعض ایسے ہوں گے جو وضو میں تعدی سے کام لیں گے آپؐ نے فرمایا کہ وضو کے معاملے میں ایک شیطان ہے جس کا نام ولہان ہے۔ یہ وضو کرنے والے کو وسواس میں ڈال دیتا ہے۔ اس خاندان کے حضرات اعضائے وضو کو کبھی ایک بار، کبھی دو بار اور کبھی تین مرتبہ دھوتے تھے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ بعض عضو کو دو بار اور بعض کو تین بار دھوتے تھے۔ یعنی اس خانوادے میں یہ تمام صورتیں جائز تھیں۔ یہ حضرات جہاں تک ہوتا، وضو کے بعد اعضائے وضو کو کپڑے سے خشک نہیں کرتے تھے۔ مصنف نے بتایا ہے کہ بعض احادیث میں آتا ہے کہ حضور اکرمؐ ایک رومال سے اپنے اعضائے وضو کو خشک فرماتے تھے۔ مصنف کے والد سید ماہ عالم جسمانی ضعف کی وجہ سے ایک رومال سے اعضائے وضو کو خشک کرتے تھے۔ حالانکہ علمائے حدیث نے اس روایت کو ضعیف بتایا ہے، لیکن بقول مصنف، ضعف بدن کیوجہ سے ضعیف حدیث پر بھی عمل کیا جا سکتا ہے (اما بواسطۂ ضعف، عمل بر حدیث ضعیف می تواں کردم) اس کے بعد مصنف نے قرآن کریم سے یہ جملہ نقل کیا ہے: خُلِقَ الْإِنسَانُ ضَعِيفًا

دوسری سیرت کے تحت مولف نے فرائض کے اول وقت میں ادا کرنے کی فضیلت سے بحث کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ صبح کی نماز غلس (یعنی آخری شب کی تاریکی) میں ادا کرنی چاہیے۔ مصنف کا یہ بیان بھی قابل غور ہے کہ اس کے خانوادہ میں حضور اکرمؐ کی سنت کی پیروی کے لیے چند امور میں امام شافعیؒ کی پیروی کی جاتی تھی۔ یہ حضرات نماز میں نیت کے لیے سینے پر ہاتھ باندھتے تھے، آمین اس طرح زور سے کہتے کہ دوسرے سُن لیں۔ سمع اللہ لمن حمدہ (ہ کو ضم کے ساتھ) پڑھتے تھے۔ حضرت ماہ عالم فرماتے تھے کہ ان تمام اعمال کا جواز حنفی مسلک کی روایات میں بھی پایا جاتا ہے۔

تیسری سیرت میں مولف نے بیان کیا ہے کہ تکبیر افتتاح کے بعد اس سلسلے کے حضرات ثنا پڑھتے تھے۔ حضور اکرمؐ سے عبارت ثنا مروی ہے۔ چونکہ اس خانوادہ نے مسلک حنفی اختیار کیا ہے، اس لیے ثنا کی یہ عبارت اس خانوادہ میں رائج ہے:

"سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالیٰ جَدُّکَ وَلَا اِلٰہَ غَیْرُکَ"

چوتھی سیرت میں اس موضوع سے بحث کی گئی ہے کہ آیا رات میں طول قیام افضل ہے یا کثرت سجود۔ اس سلسلے میں مولف نے چاروں حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی ائمہ کی روایات بیان کی ہیں، ان چاروں ائمۂ فقہ کی ایک ایک دو دو سطروں میں سوانح بھی لکھی ہے۔ مثلاً امام ابو حنیفہ کے بارے میں لکھا ہے:

"اول ائمۂ مذاہب اربعہ ابو حنیفہ نعمان بن ثابت است واو در سنہ ثمانین متولد شدہ، سیدی ماہ عالم دام جلالہ می فرمودند کہ حضرت علیہ التحیہ در شان ثابت دعا فرمودہ بود، بہ برکت دردو ذریت او بہ واسطۂ محبت اہل بیت، منصور دوانقی با او بد شد و آخر در بغداد در سنہ خمسین ومأۃ در زندانش وفات یافت۔"

اگلی سیرت میں "بعد از فرضی کہ پس آن سنت آمدہ است متصل آن، ورامی سنت ہیچ کار نکنند و فرضی کہ بعد آن سنت نیست، چنانچہ فجر و عصر باذکار و دعوات مشغول شوند" کی ہدایت کی گئی ہے۔

اذکار و درود و وظائف جو اس سلسلے میں رائج تھے، ایک سیرت میں درج ہیں سفر و حضر سے متعلق خاندانی روایات بیان کی گئی ہیں۔ تہجد کی نماز سے بحث کی گئی ہے۔ فجر کی نماز سے پہلے کی اوراد و وظائف بیان کیے گئے۔

مصنف نے لکھا ہے کہ نماز وتر کبھی اول شب میں اور کبھی وسط شب میں اور زیادہ تر آخر شب میں ادا کرنی چاہیے اور پہلی رکعت میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلیٰ پڑھیں مصنف نے بتایا ہے کہ مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ وتر کے بعد کی رکعتوں کے بارے میں حدیث سے انکار کرتے ہیں۔ احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے کہ میں وتر کی نماز کے بعد مزید نماز نہیں پڑھتا، لیکن کسی کو اس سے منع بھی نہیں کرتا۔

گیارہویں سیرت میں دعائے قنوت، بارہویں میں عیدالاضحیٰ، تیرہویں میں سجدۂ شکر کا بیان ہے۔ اسی سیرت میں مولف نے یہ اطلاع دی ہے کہ ایک بار ان کے والد ماجد سید ماہ عالم سے کسی نے کہا کہ آپ میں اور آپ کے جد اعلیٰ حضرت شاہ عالم کے درمیان بہت سی چیزیں مشابہ ہیں۔ جناب ماہ عالم نے یہ سُن کر سجدۂ شکر ادا کیا۔

چودہویں سیرت میں شب جمعہ اور جمعہ کے فضائل بیان کیے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ جمعہ مومنوں کی عید کا دن ہے، اس دن کی تعظیم کرنی چاہیے اور مختلف عبادات میں

مشغول رہنا چاہیے۔

پندرھویں سیرۃ میں عیدالفطر کا بیان ہے۔ اس ضمن میں بتایا ہے کہ نماز عید شہر سے باہر ادا کرنی چاہیے۔ اگر بارش ہو تو شہر کی مسجد میں ادا کرنی چاہیے۔ ضمناً یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت قطب الاقطاب مخدوم جہانیاں سید جلال بخاری کا وصال آخر روز عیدالاضحیٰ کو ہوا تھا، اس لیے سید ماہ عالم کہا کرتے تھے کہ: لِلنَّاسِ عِيدٌ ولنا عيدٌ (عوام کی عید ہوتی ہے اور ہماری بھی)

سولھویں سیرت میں نماز استسقا کا بیان ہے۔ اس سیرۃ کے تحت تاریخی نوعیت کی یہ اطلاع بھی دی گئی ہے کہ اثنی وتسعین وتسعمائۃ (۹۹۲/۱۵۸۴) میں شہاب الدین احمد خاں کے زمانۂ حکومت میں اس حاکم کی درخواست پر حضرت ماہ عالم احمد آباد کے حصار سے باہر حوض قطبی جو کانکریہ کے نام سے معروف ہے، تشریف لے گئے اور بارش کے لیے دعا فرمائی۔ خدا نے اپنے اس محبوب بندے کی دعا سنی، اسے قبول کیا اور خوب بارش ہوئی۔ جب ایک انگریز نے یہ صورت حال دیکھی تو وہ اسلام لے آیا اور ان کے ارادتمندوں میں شامل ہوگیا۔

ایک سیرت میں سفر سے متعلق ہدایات فراہم کی گئی ہیں۔ اس خاندان کے حضرات باصفا جمعرات کو سفر کرنا پسند کرتے تھے۔ سفر سے متعلق مختلف دعاؤں کے علاوہ اس خاندان میں سفر شروع کرنے سے پہلے اس رباعی کے پڑھنے کا معمول تھا:

بخش بارخدایا، درین خجستہ سفر — ہزار مایہ شادی و عز و جاہ و ظفر
بحق چار محمد، بہ بحق چار علی — بہ دو حسن، بہ حسین و بہ موسی و جعفر

ہمارے عرفا نے شریعت محمدی کو بہت اہمیت دی ہے۔ اسلام کا یہی وہ قانون

ہے، جس پر چل کر ہدایت ابدی اور قرب الٰہی نصیب ہوتا ہے۔ مصنف سیرۃ السادات نے بھی یہی بات کہی ہے اور یہ شعر نقل کیا ہے:

ہر کرا قرب ایزدی طلبست — سنت خواجہ صورت سبب است

اس رسالے میں تلاوت قرآن حکیم پر بہت زور دیا گیا ہے۔ جب سید ماہ عالم کے وصال کا وقت قریب پہنچا تو انھوں نے حافظ جمال الدین محمد منجھو کو جو نہایت خوش الحان قاری تھے، طلب کیا اور ان سے قرآن کی تلاوت کرنے کو کہا۔ سماع قرآن کریم کے وقت ان پر رقت طاری ہوگئی۔ یہ ان کا آخری سماع تھا۔ یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ اس خانوادہ میں تلاوت قرآن پاک پر بہت توجہ دی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے دربار شاہیہ میں قاری خاص کا ایک جداگانہ عہدہ تھا[1]

ایک سیرت میں بیماروں کی عیادت کی سفارش کی گئی ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے لکھا ہے کہ ہندوستانی عوام میں یہ مشہور ہوگیا ہے کہ رات کے وقت اور اتوار کے دن عیادت کے لیے نہیں جانا چاہیے، یہ محض ایک بدعت ہے اس پر توجہ نہیں دینی چاہیے سید ماہ عالم ایک بار شیخ کبیر بن معین کی عیادت کے لیے رسول آباد سے احمد آباد تشریف لائے اور اسی طرح ایک مرتبہ سرآمد یک رنگان سرخ روی ملک محمود بن پیارو کی مزاج پرسی کے لیے اساول تشریف لے گئے۔ مصنف نے بدعتوں کی مخالفت میں یہ جملہ لکھا ہے: از رسوم جاہلیہ منع کنند

بیسویں سیرت میں مردے کی تجہیز و تکفین سے متعلق ہدایات دی گئی ہیں۔ یہ واقعہ بھی اسی سیرت میں بیان کیا گیا ہے کہ سید ماہ عالم کے وصال کا وقت قریب تھا، ایک شخص نے بیعت ہونے کی درخواست کی۔ حالانکہ یہ نہایت نازک وقت تھا لیکن

---

[1] جلالی احمد آبادی، اکبر علی ترمذی، نوائے ادب ص ۳۲۔

انہوں نے مرید کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: خدا یکی و محمد برحق، یہی وہ آخری کلمات تھے جو زبانِ مبارک پر آئے اور حاضرین مجلس نے سُنے۔ ۱

حضرت ماہ عالم صدقۂ تطوع (نفلی صدقہ) کو بہت زیادہ پسند فرماتے تھے۔ صدقۂ تطوع ادا کرنے میں ان کو وہی خوشی محسوس ہوتی تھی جو بخیلوں اور حریصوں کو روپیہ حاصل کرنے میں ہوتی ہے۔ ان کی داد و دہش کا یہ عالم تھا کہ جس کسی نے جو کچھ مانگا اسے نامراد نہیں لوٹایا، جو حاضر ہوا، اسے عنایت کر دیا۔ حضرت کے لیے فقر تشویشناک نہیں تھا۔ نیستی ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ وہ انعام و اکرام سے لوگوں کو نوازا کرتے تھے۔ ہدیہ، ہبہ اور صدقہ ان کے اخلاق حسنہ میں شامل تھے۔ کبھی ایک چیز خریدتے، اس کی قیمت ادا کرتے اور وہ چیز اسی کو ہدیہ کر دیتے جس سے خریدتے۔ کبھی کبھی قرض بھی لیتے اور اصل رقم سے زیادہ لوٹاتے۔ بقول مصنف سیرۃ السادات یہ ربا (سود) نہیں، ربا اسے کہتے ہیں جو اضافی رقم قرض لیتے وقت طے کی جائے۔ حضرت ماہ عالم کا دعویٰ تھا کہ ان کے خاندان میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک کوئی بھی شخص باوجود حشمت دینی و دنیوی کے ہرگز صاحب نصاب نہیں ہوا۔ مولف نے بتایا ہے کہ اگر کوئی صاحب ثروت ان کو مال زکوٰۃ پیش کرتا اور اسے صاحبانِ استحقاق میں تقسیم کی درخواست کرتا تو وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور پیغمبر اسلام کی سنت کے مطابق قبول فرما لیتے اور یہ مال اربابِ استحقاق اور صاحبان دولت کی مصلحت کو پیشِ نظر رکھ کر تقسیم کر دیتے تھے۔

نماز عید کے بعد ذبح کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی فصل میں عقیقے کے بکروں کا ذکر بھی ہے۔ مولف نے لکھا ہے کہ: عقیقہ در لغت آن موئی است کہ اول بر سر طفل برون می آید... و حضور اکرم این نام را مکروہ داشتی و بدل عقیقہ نسک فرمودی۔ حضرت ماہ عالم فرمایا کرتے

تھے کہ: گویا وجہ کراہت آن باشد کہ مشتق از عقوق ملتبس می شود - یعنی یہ التباس ہوتا ہے کہ عقیقہ، عقوق سے مشتق ہے جس کے معنی والدین کی نافرمانی، احسان فراموشی اور مردود کے ہیں۔

ایک سیرت میں وضاحت کی گئی ہے کہ جو کچھ موجود ہو، اگر وہ مباح ہے، اسے استعمال کرنا چاہیے۔ اس طرح کسی چیز کو کھانے سے انکار نہیں کرنا چاہیے اور ایسی چیز کی طلب نہیں کرنی چاہیے جو موجود نہ ہو۔

حضرت ماہ عالم اکثر جامۂ پنبگی (سوتی) زیب تن کرتے تھے۔ کبھی پشمینہ اور کبھی کتان (باریک) کے کپڑے بھی پہنتے تھے۔ بہرحال جو کچھ میسر ہوتا بلا تکلف اس پر اکتفا کرتے تھے، قبا، پیراہن، زیر جامہ، ردا وغیرہ استعمال میں رہتی تھیں، ان کو قمیص پسند تھی۔ دونوں کندھوں کے درمیان عمامے کا شملہ (عذبہ) چھوڑتے تھے اور کبھی بغیر شملے کے بھی عمامہ باندھتے تھے۔ کبھی تحت الحنک باندھتے یعنی صافے کا ایک بل ٹھوڑی کے نیچے سے نکالتے تھے۔ ہر لباس کا ایک نام رکھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے: اللھم کسوتنی ھذا القمیص۔ عمامہ کبھی کلاہ پر اور کبھی بغیر کلاہ کے باندھتے، کبھی صرف ٹوپی اوڑھتے۔

تجمل و نعمت خداوندی کے اظہار کے لیے لباس فاخرہ بھی زیب تن فرماتے تھے اور اگر ان کا نفس اس قسم کے لباس کا خواہاں ہوتا تو نفس کشی کی خاطر وہ لباس دوسروں کو بخش دیتے تھے۔ لمبے دامن کو مکروہ سمجھتے تھے۔ سُرخ جبہ (سُرخ چادر، حلۂ حمراء) جس پر سرخ علم بنے ہوتے۔ اسے استعمال کرنے کی نہ صرف تجویز رکھتے بلکہ خود بھی اسے استعمال کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی پوستین، موزہ، نعل (جوتے) اور انگوٹھی بھی پہنتے تھے۔ ان کی ردا کی لمبائی چھ گز، چوڑائی تین گز ایک وجب (بالشت) اور ازار (شلوار) چادر کی لمبائی چار گز اور ایک وجب اور چوڑائی دو گز اور ایک وجب ہوتی تھی۔

ایک سیرت میں متعدد امور سے بحث کی گئی ہے۔ مثلاً بیع و شرا کم کریں، قسم نہ کھائیں، دوسروں کی سفارش کریں اور دوسروں کی سفارش پر توجہ دیں۔ مختلف امور میں باہمی مشورہ کریں (قرآن کریم میں حکم ہے کہ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ)، شوخی و مزاح کو بری نظر سے نہ دیکھیں لیکن بے بنیاد اور جھوٹ نہ ہو۔ شعرا سے مدحیہ کلام سُنا جائے، شعرا کو انعام و اکرام سے نوازا جائے، ان کی سرپرستی کی جائے ہم جانتے ہیں کہ اس خانوادۂ مشائخ کی خانقاہوں سے شعرا رسماً وابستہ تھے۔ دربار شاہیہ سے وابستہ شعرا کی فہرست میں فارسی کے علاوہ ہندی کے شاعروں کے نام بھی نظر آتے ہیں۔ سید جعفر بدر عالم نے اپنی صدحکایت میں اللہ دیا نام کے ایک شاعر کا فارسی قصیدہ نقل کیا ہے جو حضرت شاہیہ (شاہ عالم) کی مدح میں ہے۔ اس قصیدے کے دو بیت درج ذیل ہیں:

جانم فدات باد کہ از جان نکوتری — تنہا ترا رسد ز ہمہ خلق برتری

شاہ و گدا بحضرت عالی برابر اند — کز قہر و لطف بخشد فقر و تونگری

حضرت ماہ عالم بے پناہ مہمان نواز تھے۔ خاص طور پر بن بلائے مہمان کی خاطرداری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے چونکہ وہ اسے ہدیۂ خدا سمجھتے تھے۔ عورتوں سے بے ضرورت بات چیت کرنے سے اجتناب کا مشورہ دیتے چونکہ وہ ناقصات العقل والدین اند۔

حضرت ماہ عالم کا عقیدہ تھا کہ اس دنیا میں گھر بار پر بہت زیادہ توجہ نہ دی جائے یہ زندگی ایک سفر ہے اور یہ سفر کہاں اور کس وقت ختم ہو جائے، کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ محض ایسے گھروں پہ اکتفا کیا جائے جو انسان کو سردی، گرمی، وحشی جانوروں کے خطرے سے محفوظ رکھے اور ہر آنے جانے والے کی نظر سے بچائے، کوئی

مالدار شخص دوسروں کے لیے عالی شان مکان بنانے کی تجویز رکھے تو اگر استخارہ سے اسکی اجازت مل جائے تو دوسروں کے نفع کی خاطر اسے قبول کر لیا جائے۔ مصنف نے اس ضمن میں یہ شعر نقل کیا ہے:

دانی کہ چیست تا کہ نشینند دوستان — کاشانہائی سر بفلک برفراشتن

اگر کبھی گھر بنانے کی نوبت آجائے تو مزدوروں سے رحم و دوستی کا سلوک کیا جائے اپنے بھائی بندوں اور اہل بیت کی زیادتیوں کو صبر و شکر سے برداشت کرنا چاہیے صبر و تحمل پیغمبرانہ شان ہے۔ مصنف نے اس اخلاقی فضیلت کی اہمیت کو اس واقعہ سے واضح کیا ہے کہ: ایک بار ایک یہودی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور بدتمیزی سے پیش آیا۔ صحابۂ کرام مجلس میں موجود تھے۔ یہودی کا یہ رویہ انکے لیے ناقابل برداشت تھا۔ وہ بھڑک اٹھے اور اسے سزا دینی چاہی۔ پیغمبر اسلامؐ نے منع فرمایا اور صبر و تحمل کی تلقین کی اور یہودی کو اس کی نازیبا حرکت پہ معاف کر دینے کا حکم دیا یہودی نے یہ صورت حال دیکھی اور کہا کہ میں نے آپؐ میں نبوت کی جملہ علامتیں مشاہدہ کی تھیں، صرف ایک علامت دیکھنی باقی تھی اور وہ یہ ہے کہ کتنا ہی زیادہ کوئی بے ادبی اور جہالت کا ثبوت دے، آپ اتنا ہی زیادہ اس پر رحم کریں اور اسے معاف کر دیں۔ نبوت کی یہ شان بھی آج میں نے آپؐ میں دیکھ لی ہے۔ آپؐ بے شک پیغمبر خدا ہیں، یہودی اس کے بعد مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ درحقیقت یہی صبر و شکر، تسلیم و رضا اسلامی تعلیمات کی روح ہیں:

کشتگانِ خنجر تسلیم را — ہر زمان از غیب جانی دیگر است

ایک سیرت میں بیان کیا گیا ہے کہ وقار و تمکنت اور عیش و آرام کی زندگی کے

باوجود انسان کو اس طرح چلنا چاہیے گویا کہ وہ کسی بلندی سے نیچے کی طرف آرہا ہو۔ یہ صاحبان ہمت کا طریقہ ہے۔ اس فصل میں یہ ہدایت بھی دی گئی ہے کہ انسان کو نہ زیادہ زور سے ہنسنا چاہیے اور نہ رونا۔

حضرت ماہ عالم مجلس سماع میں نہایت تمکیں و بردباری سے کام لیتے تھے۔ اور گریہ وزاری کو ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے، لیکن سحر میں خلوت کے وقت اسقدر روتے کہ آنسوؤں کے قطرے ان کے لباس پر مروارید (موتیوں) کی طرح ٹپکتے اور چمکتے تھے۔ لوگوں سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے اور اس سلسلے میں شیخ باجن چشتی کا جو برہان پور خاندیس میں آرام فرما ہیں، یہ ہندی شعر پڑھا کرتے تھے:

رورو پند نہ برکت کیجی   ہنس ہنس اوتر دیجی

حق کے لیے جنگ کرنا جائز ہے۔ جہاد اکبر یہ ہے کہ انسان اپنے نفس سے جنگ کرے۔ کھانا بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر شروع کرے اور اگر کھانے کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو بعد میں پڑھے۔

حضرت ماہ عالم نے اپنے جد سید محمد بن عبداللہ ملقب بہ شاہ عالم کے بارے میں یہ نہایت اہم اطلاع بہم پہنچائی ہے کہ ایک بار وہ خلوت میں تھے۔ گجرات کا بادشاہ سلطان قطب الدین ان کی خانقاہ میں آیا۔ وہ ان کی اجازت کے بغیر خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تھا۔ ملک مقبل بواب (جو غالباً خانقاہ کے دروازہ پر پہرہ دار کی حیثیت سے موجود تھا) نے بغیر اجازت اندر جانے سے منع کیا اور اپنے ہاتھ کا عصا بادشاہ کے سامنے کر دیا۔ لوگ دیکھ رہے تھے۔ وہ غل مچانے لگے۔ حضرت شاہ عالم کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی۔ فرمایا: بادشاہ کو اندر آنے دیا جائے، لیکن ملک مقبل سے

کوئی باز پرس نہیں کی، چونکہ اس نے کوئی نامشروع قدم نہیں اٹھایا تھا۔ اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد مصنف نے یہ نہایت اہم تاریخی اطلاع دی ہے کہ:

سلطان را چنانکہ مقتضا و غرور سلطنت است، این امر گران آمد و در آن نزدیکی از ین عالم رخت بر بست۔

سلطنت کے غرور اور زعم کی وجہ سے یہ واقعہ بادشاہ پر گراں گزرا وہ اس بے عزتی کی تاب نہ لاسکا اور اتنا متاثر ہوا کہ تھوڑے ہی دن بعد فوت ہوگیا۔

اس سلطان قطب الدین کو اپنی سلطنت کے ابتدائی ایام میں حضرت شاہ عالم سے بے حد عقیدت تھی، لیکن بعد میں چند اسباب کی وجہ سے رنجش ہوگئی۔ اس بادشاہ نے ان کی مدح میں ہندی میں شعر بھی کہے تھے (جمعات شاہیہ)۔

ایک سیرت میں ہدایت کی گئی ہے کہ جیسے ہی بیدار ہوں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِی اَحْیَانَا پڑھیں۔ حضرت ماہ عالم کا قول تھا کہ بعض صوفیہ کا معمول ہے کہ وہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِی اَحْیَانَا کے علاوہ بھی جسم کے مختلف اعضاء کی مناسبت سے بعض دعائیں پڑھتے ہیں، لیکن ان کے خانوادۂ سادات میں وہ رائج نہیں۔ اس خانوادہ میں وضو کے دوران تشہد پڑھنے کا رواج تھا۔

دوسروں کے لیے بد دعا نہ کریں اور لوگوں کو بد دعا کرنے سے روکیں چونکہ ممکن ہے کہ جس وقت بد دعا کی جائے وہ استجابت دعا کا وقت ہو اور مبادا بد دعا قبول ہو جائے۔ دعا اور اس کے قبول ہونے کے لیے مصنف نے حضرت ماہ عالم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

کسی مسلمان کی دعا رد نہیں کی جاتی۔ وہ یا تو فوراً قبول ہو جاتی ہے اور یا پھر خدا اس کے بدلے میں دعا کرنے والے کی کوئی اور بات قبول کر لیتا ہے اور یا پھر اس کی دعا کو اس کے ذخیرۂ آخرت میں جمع کر دیا جاتا ہے۔ فرمایا کہ جب کوئی شخص دعا کرے تو اسے اپنے دل میں اپنی تمام عبادتوں اور اطاعتوں کا خیال نہیں لانا چاہیے چونکہ اس طرح اس کے دل میں عبادت کا غرور و تکبر پیدا ہو سکتا ہے اور یہ دعا کے قبول ہونے میں مانع ہو سکتا ہے۔ اسی طرح دعا کرنے والے کو دعا کرتے وقت اپنے گناہوں اور معصیتوں کا خیال بھی دل میں نہیں لانا چاہیے۔ اس لیے کہ اس طرح دعا کے قبول ہونے کے اعتقاد و بھروسے میں سستی و کمزوری واقع ہو سکتی ہے۔ انسان کو دعا کرتے وقت صرف رحمت حق پر نظر رکھنی چاہیے اور یہی تصور اس کے ذہن میں رہے کہ اس کی دعا البتہ قبول ہوگی۔

بزم صوفیہ

از

سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم

اس کتاب میں تیموری عہد سے پہلے کے ہندوستان کے باکمال صوفیہ کا تذکرہ ہے، جنھوں نے اپنے دور کے مسلم معاشرہ کے مذہب، اخلاق، معاشرت اور سیاست کو سنوارا اور اسلام کی معنوی شوکت و عظمت دلوں میں بٹھائی۔

عام طور پر لوگ اس غلط فہمی کے شکار ہیں کہ خواجگان چشت رنگینی و سرمستی اور نغمہ و سرور کے دلدادہ تھے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ خیال زائل ہو جاتا ہے۔

قیمت ۱۱۵ روپے۔

"منیجر"

تلمیحات و اشارات خواجہ حافظ شیرازیؒ

از

جناب محمد ذاکر حسین ندوی مدھوبنی

(۲)

دار السلام : بہشت مراد ہے ؎

در عیش نقد کوش کہ چون آبخور نماند ... آدم بہشت روضۂ دار السلام را

دم عیسیٰ : حضرت عیسیٰؑ اپنی پھونک سے مردہ کو زندہ کر دیتے تھے۔ اسی کو دم عیسیٰ کہتے ہیں ؎

باکہ این نکتہ توان گفت کہ آن سنگین دل ... کشت مارا و دم عیسیٰ مریم با اوست

روضۂ رضوان : بہشت مراد ہے ؎

فردا اگر نہ روضۂ رضوان بہ ما دہند ... غلمان ز روضۂ حور ز جنت بدر کشیم

زلیخا : عزیز مصر کی شریک حیات جو حضرت یوسفؑ پہ فریفتہ ہوگئی تھی۔ یہ داستان بہت مشہور ہے۔ اکثر فارسی شعراء نے اس داستان کو بیان کیا ہے۔ اس میں سب سے مشہور جامی کی یوسف زلیخا ہے ؎

من از آن حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم ... کہ عشق از پردۂ عصمت برون آرد زلیخا را

زہرہ : سب سے چمکدار ستارہ ہے۔ قدما اس کو سعد اور نیک شگون

مانتے تھے ؎

بگشیر طرۂ مہ چہرہ ای و قصہ مخوان — کہ سعد و نحس ز تاثیر زہرہ و زحل است

سالک : حضرات صوفیائے کرام کی زیر تربیت جو لوگ رہتے ہیں انکو تصوف کی اصطلاح میں سالک کہا جاتا ہے ؎

بہ می سجادہ رنگین کن گرت پیر مغان گوید — کہ سالک بی خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

سامری : بنی اسرائیل کا ایک فرد جس نے حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں گوسالہ بنایا اور لوگوں کو اس کی پرستش کرنے پر آمادہ کیا ؎

سحر با معجزہ پہلو نزند دل خوش دار — سامری کیست کہ دست از ید بیضا ببرد

سبا : ایک ملک کا نام جسکی حکمراں ایک عورت تھی، اس کا نام بلقیس بتایا جاتاہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اس کا ملک فتح کرنے کے بعد اس سے شادی کرلی تھی ؎

ای ہدہد صبا بہ سبا می فرستمت — بنگر کہ از کجا بہ کجا می فرستمت

سدرہ : ایک درخت ہے جو عرش کے دائیں جانب ہے ؎

کہ ای بلند نظر شاہباز سدرہ نشین — نشیمن تو نہ این کنج محنت آباد است

سلسبیل : بہشت کے ایک چشمہ کا نام ہے ؎

ای رخت چون خلد و لعلت سلسبیل — سلسبیلت کردہ جان و دل سبیل

شبان وادی ایمن : حضرت موسیٰؑ مراد ہیں، حضرت شعیبؑ کی لڑکی سے ان کی شادی ہوئی اور مہر میں ان کی بکریاں چرائیں ؎

شبان وادی ایمن گہی رسد بہ مراد — کہ چند سال بہ جان خدمت شعیب کند

شب قدر : رمضان المبارک کی ایک مبارک رات ہے جو ہزار راتوں سے بہتر ہے۔ سورۃ القدر میں اس کا ذکر ہوا ہے ؎

آن شب قدری کہ گویند اہل خلوت امشب است — یا رب این تاثیر دولت از کدامین کوکب است

شش جہت : یعنی شمال و جنوب، مشرق و مغرب اور زیر و بالا ؎

شہری است پر کرشمہ و خوبان ز شش جہت — چیزیم نیست ورنہ خریدار ہر ششم

شعیبؑ : ایک برگزیدہ نبی ہیں۔ ان پر ایمان نہ لانے کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم پر گرمی کی صورت میں عذاب مسلط کیا۔ پریشان ہوکر ان لوگوں نے صحرا کی پناہ لیا، لیکن بادل سے آگ کی بارش ہونے لگی۔ اس عذاب سے صرف ایمان والے محفوظ رہے۔ حضرت موسیٰؑ جب فرعون کے خوف سے مصر سے نکلے تو انھوں نے ہی انکو پناہ دی اور اپنی لڑکی سے شادی کردی ؎

شبان وادی ایمن گہی رسد بہ مراد — کہ چند سال بہ جان خدمت شعیب کند

شیخ صنعان : شیخ عطار نے "منطق الطیر" میں ان کا ذکر کیا ہے کہ باوجود تقویٰ و زہد کے وہ ایک عیسائی لڑکی پر ایسا عاشق ہوئے کہ دین و ایمان کو اس پر فدا کردیا، قرآن کو جلایا۔ پھر اپنے مریدوں کی دعاؤں کے طفیل راہِ راست پر آگئے اور ان کے ساتھ وہ عیسائی لڑکی بھی مشرف بہ اسلام ہوگئی۔

گر مرید راہ عشقی فکر بدنامی مکن — شیخ صنعان خرقہ رہن خانہ خمار داشت

طارم فیروزہ : آسمان مراد ہے ؎

بجز آن نرگس مستانہ کہ چشمش مرساد — زیر این طارم فیروزہ کسی خوش ننشست

طالع : علم نجوم کی اصطلاح میں برج اور ایسا درجہ جو ولادت یا کسی امر کے

وقوع کے وقت افق سے نمودار ہوتا ہے اور منجم اس کو دیکھ کر نوزادہ کی قسمت اور کسی
کام کے نتیجہ کا پتہ لگاتا ہے ؎

کوکب بخت مرا ہیچ منجم نشناخت   یارب از مادر گیتی بہ چہ طالع زادم

طوبیٰ : بہشت کا ایک درخت ہے ؎

باغ بہشت و سایۂ طوبیٰ و قصر حور   با خاک کوی دوست برابر نمی کنم

طور : ایک پہاڑ کا نام جہاں حضرت موسیٰؑ مناجات کی غرض سے گئے
تھے۔ احد پہاڑ اسی کا ایک حصہ ہے۔ یہیں پر حضرت موسیٰؑ نے دیدار الٰہی کی
التجا کی تھی ؎

شب تار است و رہ وادی ایمن در پیش   آتش طور کجا موعد دیدار کجاست

طور سینا : کوہ طور کو کہتے ہیں ؎

آشنای طور سینا موسی عمران بود   تا کہ از معجز عصا در دست او گردد چو مار

طوفان : طوفان نوح کی طرف اشارہ ہے ؎

حافظا از دست مدہ دولت این کشتی نوح   ورنہ طوفان حوادث ببرد بنیادت

ظلمات : بحر ظلمات مراد ہے۔ حضرت خضرؑ نے آب حیات کی تلاش میں
اس کا سفر کیا تھا ؎

قطع این مرحلہ بی ہمرہی خضر مکن   ظلمات است بترس از خطر گمراہی

عدن : لفظی معنی قیام کرنے کے ہیں۔ بہشت کا ایک باغ ہے ؎

بہشت عدن اگر خواہی بیا با ما بہ میخانہ   کہ از پای خمت یکسر بہ حوض کوثر اندازیم

عزیز مصر : ادبیات فارسی میں اس کا اطلاق کبھی حضرت یوسفؑ پر

ہوتا ہے ؎

عزیز مصر بہ رغم برادران غیور   ز قعر چاہ برآمد بہ اوج ماہ رسید

عنقا : ایک خیالی پرندہ ہے۔ ادبیات فارسی میں استغنا و بے نیازی کا
نمونہ تصور کیا جاتا ہے ؎

ببر ز خلق و ز عنقا قیاس کار بگیر   کہ صیت گوشہ نشینان ز قاف تا قاف است

فرہاد : شیریں اور فرہاد کی داستان معاشقہ بہت مشہور ہے۔ شیریں
خسرو کی بیوی تھی جس سے فرہاد کو بے پناہ محبت ہو گئی تھی۔ خسرو فرہاد کی محبت
اور اس کی فداکاری کو دیکھ کر اس کو کوہ بے ستون کے کھودنے پر لگا دیا۔ وہ
تندہی سے یہ کام کر رہا تھا کہ خسرو نے شیریں کی موت کی جھوٹی خبر اڑا دی۔ یہ
خبر سنتے ہی وہ اسی تیشے کو اپنے سر پر مارا اور مر گیا ؎

دل بہ امید صدایی کہ مگر در تو رسد   نالہ ہا کرد درین کوہ کہ فرہاد نہ کرد

قِران : لغوی معنی نزدیک و قریب ہونے کے ہیں۔ علم نجوم کی اصطلاح
میں وہ وقت جب دو ستارہ یکجا جمع ہوں۔ ستاروں کا بعض قران نحس ہے اور بعض
سعد۔ ماہ و مشتری کا وہ قران جو ہر مہینہ یکبار واقع ہوتا ہے وہ سعد ہوتا ہے ؎

گفتم کہ خواجہ کسی بہ سر حجلہ می رود   گفت آن زمان کہ مشتری و مہ قران کنند

کلبۂ احزان : وہ گھر جہاں حضرت یعقوبؑ گوشہ نشین تھے اور فراق یوسفؑ
میں آنسو بہا رہے تھے ؎

یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعان غم مخور   کلبۂ احزان شود روزی گلستان غم مخور

کنعان : ایک شہر ہے جہاں حضرت یعقوبؑ اپنے ماموں کے ہاں پناہ گزیں

ہوئے اور وہیں مقیم ہو گئے ؎

یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعان غم مخور   کلبۂ احزان شود روزی گلستان غم مخور

کوثر : بہشت کا ایک چشمہ جس سے تمام چشمے جاری ہیں۔ قیامت کے روز آنحضرتؐ اپنے امتی کو یہ پیش کریں گے ؎

زاہد شراب کوثر و حافظ پیالہ خواست   تا در میانہ خواستۂ کردگار چیست

گندم : وہ دانہ جس کا کھانا حضرت آدمؑ و حواؑ کے لیے بہشت میں منع کیا تھا، مگر شیطان کے فریب میں آکر انھوں نے کھا لیا جس سے وہ راندۂ درگاہ ہو گئے ؎

پدرم روضۂ رضوان بہ دو گندم بفروخت   ناخلف باشم اگر من بہ جوی نفروشم

گوسالہ سامری : سامری نامی ایک شخص نے حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں سونا چاندی سے ایک بچھڑا بنایا تھا اور لوگوں کو اس کی پرستش پر آمادہ کیا تھا۔ روایتوں کے مطابق اس نے وہ مٹی لیا تھا جس پر حضرت جبرئیلؑ کے گھوڑوں کے پاؤں پڑے تھے جس سے اس کے اندر آواز اور حرکت پیدا ہوئی تھی ؎

چون سامری مباش کہ زر دادہ و از خری   موسیٰ بہشت و از پی گوسالہ می رود

لیلیٰ : لیلیٰ مجنوں کی داستان عشق کافی مشہور ہے۔ لیلیٰ قبیلہ بنی عامر کی دختر تھی ایام طفولیت ہی میں اس کو قیس نامی ایک شخص سے محبت و علاقہ ہو گیا۔ لیکن باپ کی رضامندی نہ ہونے کی وجہ سے اس کی شادی ابن السلام سے ہو گئی لیکن اس نے اپنے شوہر کو اپنا جسم سپرد نہیں کیا۔ آخر کار وہ اس دنیا سے کوچ کر گئی۔ اس داستان کو بہت سے فارسی شاعروں نے شعری جامہ پہنایا ہے ؎

شبی مجنوں بہ لیلیٰ گفت کای محبوب بی ہمتا   ترا عاشق شود پیدا ولی مجنوں نخواہد شد

ماچین : وہ ملک جو چین کے جنوب اور ہند کے مشرق میں واقع ہے ؎

دو چشم شوخ تو برہم زدہ ختا و ختن   بہ چین زلف تو ماچین و ہند دادہ خراج

ماہ کنعان : حضرت یوسفؑ مراد ہیں ؎

ماہ کنعانی من مسند مصر آن تو باشد   جای آن است کہ بدرود کنی زندان را

مجنون : لیلیٰ کا عاشق۔ اس کا نام قیس ہے۔ چونکہ لیلیٰ کی محبت میں دیوانگی طاری ہو گئی تھی اس لیے مجنوں نام پڑ گیا ؎

شبی مجنوں بہ لیلیٰ گفت کای محبوب بی ہمتا   ترا عاشق شود پیدا ولی مجنوں نخواہد شد

محمود : سلطان محمود غزنوی کی طرف اشارہ ہے، جو ادبیات فارسی میں شعر و ادب کے سرپرست حامی، قدرداں اور ایاز کے عاشق کی وجہ سے مشہور ہیں ؎

غرض کرشمۂ حسن است ورنہ حاجت نیست   جمال دولت محمود را بہ زلف ایاز

مرغ سلیمان : اس سے مراد ہدہد پرندہ ہے جو حضرت سلیمانؑ کا پیغامبر تھا ؎

قافلہ شب چہ شنیدی ز صبح   مرغ سلیمان چہ خبر از سبا

مسیحا : حضرت عیسیٰؑ کا لقب ہے ؎

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید   دیگران ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

منصور : منصور حلاج مراد ہیں۔ یہ برگزیدہ صوفی اور عالی مقام عارف تھے۔ ان سے بہت سی خوارق عادت باتیں ظہور پذیر ہوئیں۔ جن کو بعض لوگوں نے سحر اور جادو تصور کیا۔ ان کو "انا الحق" کہنے پر جیل میں ڈال دیا گیا اور پھر مقتدر عباسی کے وزیر حامد بن عباس کے حکم سے تختہ دار پر لٹکا دیا گیا ؎

منصور بر سر دار این نکتہ خوش سرآید　　از شافعی مپرس امثال این مسائل

ناہید : زہرہ ستارہ جو مطربوں اور خنیاگروں کا ستارہ ہے ؎

غزلسرائی ناہید صرفہ ای نبرد　　درآن مقام کہ حافظ برآورد آواز

نغمۂ داؤد : لحن داؤدی مراد ہے جس کو سنکر چرند و پرند مست و بیخود ہوجاتے تھے ؎

چو گل سوار شد بر ہوا سلیمان وار　　سحر کہ مرغ درآید بہ نغمۂ داؤد

نفس مسیحا : حضرت عیسیٰؑ کے اس معجزہ کی طرف اشارہ ہے کہ وہ مردہ کو زندہ کردیتے تھے ؎

مژدہ ای دل کہ مسیحا نفسی می آید　　کہ ز انفاس خوشش بوی کسی می آید

نگین سلیمان : انگشتری سلیمان مراد ہے ؎

من آن نگین سلیمان بہ ہیچ نستانم　　کہ گاہگاہ در انگشت اہرمن باشد

وادیٔ ایمن : وہ بیابان جہاں حضرت موسیٰؑ کو آگ کی روشنی نظر آئی تھی اور اس سے یہ غیبی آواز آئی کہ 'انا اللہ' یعنی میں خدا ہوں ؎

شب تار است و رہ وادی ایمن در پیش　　آتش طور کجا وعدۂ دیدار کجاست

ہاتف : سروش کا مرادف یعنی غیبی آواز دینے والا ؎

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بہ گوش　　کہ دور شاہ شجاع است می دلیر بنوش

ہاروت و ماروت : بابل کے دو جادوگروں کا نام ہے جو جادوگری میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ چاہ بابل میں ان کو قید کردیا گیا ہے ؎

گر بایدم شدن سوی ہاروت بابلی　　صد گونہ ساحری بکنم تا بیارمت

ہدہد : وہ پرندہ جو حضرت سلیمانؑ کا پیغام بلقیس ملکۂ سبا کے پاس لے گیا تھا۔ فارسی شاعری میں کبھی باد صبا کو جو عاشقوں کا پیامبر ہے، ہدہد سے تشبیہ دیتے ہیں ؎

ای ہدہد صبا بہ سبا می فرستمت　　بنگر کہ از کجا بہ کجا می فرستمت

ہفت آسمان : طبقات ہفتگانہ آسمان ؎

گفتم دعای دولت تو ورد حافظ است　　گفت این دعا ملایک ہفت آسمان کنند

یار : حافظ شیرازی نے اس شعر میں یار سے مراد منصور حلاج لیا ہے ؎

گفت آن یار کزو گشت سر دار بلند　　جرمش این بود کہ اسرار ہویدا میکرد

حافظ کے اشعار میں قرآن، حدیث اور عربی ضرب الامثال کا استعمال

خواجہ حافظ شیرازی نے اپنے اشعار میں قرآن شریف، حدیث اور عربی ضرب الامثال کا استعمال بھی کثرت سے کیا ہے۔ بعض میں ہو بہو عربی الفاظ شامل کیا ہے اور بعض میں اس کا مفہوم ادا کیا ہے۔ اس سے قبل جو تلمیحات بیان ہوئے ہیں ان کو میں نے ابجدی ترتیب سے مرتب کیا ہے اور قرآن، حدیث اور ضرب الامثال کا جہاں انھوں نے استعمال کیا ہے، ان کو الگ سے مرتب کیا گیا ہے۔ ذیل میں جو نمونے دیئے جارہے ہیں وہ ایک اجمالی خاکہ ہے، ان کے پورے کلام کو نہیں لیا گیا ہے۔ اگر پورے کلام میں تلاش کیا جائے تو ایک دفتر تیار ہوجائے۔ یہاں صرف تعارف مقصود ہے :

طوبیٰ لھم وحسن مآب : یہ پارہ ۱۳، رکوع ۱۰، آیت ۲۹ کا ایک ٹکڑا ہے جس کو حافظ نے اسی شکل میں استعمال کیا ہے ؎

بہ حسن عارض و قد تو بردہ اند پناہ　　بہشت و طوبی و طوبی لھم و حسن مآب

سلام هی حتی مطلع الفجر : یہ سورۃ القدر آیت ۵ کی عبارت ہے

شب وصل است وطی شدہ نامۂ ہجر
سلام فیہ حتی مطلع الفجر

والصلح خیر : پارہ ۵، رکوع ۱۹، آیت ۱۲۸۔ خواجہ صاحب نے اس کا مفہوم اپنے اس شعر میں ادا کیا ہے ؎

ع ای نور دیدہ صلح بہ از جنگ و داوری

ان مع العسر یسرا : پارہ ۳۰، رکوع ۱، آیت ۶۔ یہی مفہوم حافظ کے ان اشعار میں ہے ؎

دائما یکساں نماند کار دوراں غم مخور
در ہجر وصل باشد و در ظلمت است نور

صبر کن حافظ بسختی روز و شب
عاقبت روزی بیابی کام را

لیس للانسان الا ما سعی : سورۃ النجم، آیت ۳۹

ع کای نور چشم من بجز از کشتہ نداری

من دخلہ کان آمنا : پارہ ۴، رکوع ۱، آیت ۹۶

انگند و کُشت و حرمت صید حرم نداشت

والسن بالسن والجروح قصاص : پارہ ۶، رکوع ۱۱، آیت ۴۵

محتسب خم شکست و من سر او
السن بالسن والجروح قصاص

شقی و سعید : پارہ ۱۲، رکوع ۹، آیت ۱۰۵۔

ز قسمت ازل چہرہ سیہ بختیاں
بہ شست و شوی نگردد سعید این مثل

والراسخون فی العلم : پارہ ۳، رکوع ۹، آیت ۷

شرح مجموعۂ گل مرغ سحر داند و بس
نہ ہر کو ورقی خواند معانی داشت

فاینما تولوا فثم وجہ اللہ : پارہ ۱، رکوع ۱۴، آیت ۱۱۵

ہر جا کہ ہست پرتو روی حبیب ہست
ہمہ جا خانۂ عشق است چہ مسجد و کنشت

ولا تجادلوا : پارہ ۲۱، رکوع ۱، آیت ۴۶

نہ عمر خضر بماند، نہ ملک اسکندر
نزاع بر سر دنیای دوں مکن درویش

فالق الاصباح : پارہ ۷، رکوع ۱۸، آیت ۹۷

سواد موی تو تفسیر جاعل الظلمات
بیاض روی تو تبیان فالق الاصباح

میقات : فَتَمَّ مِيقَاتُ رَبِّهِ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً، پارہ ۹، رکوع ۷، آیت ۱۴۲

با تو آن عہد کہ در وادی ایمن بستم
ہمچو موسیٰ ارنی گوئی بہ میقات بریم

حسبنا اللہ، کفی باللہ : پارہ ۴، رکوع ۸، آیت ۱۷۳۔ پارہ ۵، رکوع ۱۶، آیت ۱۳۲

یا با ماست چہ حاجت کہ زیادت طلبیم
دولت صحبت آن مونس جان ما را بس

صنع اللہ الذی اتقن کل شئی : پارہ ۲۰، رکوع ۳، آیت ۸۸

وما تری فی خلق الرحمن من تفاوت : پارہ ۲۹، آیت ۳، سورۃ الملک

پیر ما گفت خطا بر قلم صنع نرفت
آفرین بر نظر پاک خطا پوشش باد

وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ : پارہ ۳۰، رکوع ۲، آیت ۲۹۔

گر رنج پیش آید و گر راحت ای حکیم
نسبت مکن بغیر کہ اینہا خدا کند

الست : سورۃ الاعراف، آیت ۱۷۲۔

مقام عیش میسر نمی شود بی رنج
بلی بحکم بلا بستہ اند عہد الست

اناعرضنا الامانۃ : پارہ ۲۲، رکوع ۶، آیت ۷۲

آسمان بار امانت نتوانست کشید | قرعہ کار بنام من دیوانہ زدند

رحمۃ للعٰلمین : پارہ ۱۷، رکوع ۱، آیت ۱۰۷

پیر ما گفت خطا بر قلم صنع نرفت | آفرین بر نظر پاک خطا پوشش باد

قبس : لعلی آتیکم منھا بقبس۔ پارہ ۱۶، رکوع ۱، آیت ۱۰

نا آتش وادی ایمن نہ منم خرم و بس | موسیٰ اینجا بہ امید قبسی می آید

انی اشم رائحۃ الرحمٰن من جانب الیمن : یہ حدیث کا ایک ٹکڑا ہے ؎

تا ابد معمور باد این خانہ کز خاک درش | ہر نفس با بوی رحمٰن می وزد باد یمن

آخر الدواء الکی : آخری علاج داغنا ہے۔ یہ حدیث کی عبارت ہے ؎

بصوت بلبل و قمری اگر نہ نوشی می | علاج کی کنمت آخر الدواء الکی

ان اولیاء اللہ لا یموتون : حدیث ہے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق | ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما

من جرب المجرب حلت بہ الندامۃ : ضرب المثل ہے یعنی آزمودہ کو آزمانا پشیمانی کا باعث ہوتا ہے ؎

ہر چند کازمودم ازوی نبود سودم | من جرب المجرب حلت بہ الندامۃ

شعر العجم (علامہ شبلیؒ)

شعر العجم کی دوسری جلد میں خواجہ حافظ کے حالات اور شاعری پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور چوتھی و پانچویں جلد میں بھی علامہ نے ان کے جوش و سرمستی سے معمور کلام کا والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے۔

قیمت مکمل سٹ ۱۹۵ روپے۔

"منیجر"

یکساں سول کوڈ

مترجمہ جناب عبد المنان ہلالی صاحب

"۵ جولائی ۱۹۹۵ء کے ٹائمز آف انڈیا میں جناب ایچ، ایم سروائی کا یہ مضمون شایع ہوا، اہمیت و افادیت کے پیش نظر یہاں اس کا ترجمہ شایع کیا جا رہا ہے"۔

یکساں سول کوڈ کا مسئلہ جسٹس کلدیپ سنگھ اور جسٹس سہائے کے ایک فیصلہ کی وجہ سے اس وقت پھر بہت زور و شور سے اٹھا ہے، سرلا مدگل بنام یونین آف انڈیا (۱۹۹۵ء ۳۔ایس سی سی) کی تین عرضداشتوں میں یہ سوال مشترکہ طور پر سامنے آیا تھا کہ "کیا ایک مذہب کے مرد و عورت کا عقد اس وقت فسخ ہو جاتا ہے جب ان دونوں میں سے کوئی کسی دوسرے مذہب کو اختیار کر لیتا ہے"؟ ظاہر ہے اس کا فیصلہ دستور اور قانون کے مطابق ہی کیا جانا تھا، اس میں کہیں سے یکساں سول کوڈ کی ضرورت و عدم ضرورت کی بحث کی گنجایش نہیں تھی، اس لیے توقع کے مطابق دونوں ججوں نے ان عرضداشتوں کو خارج کر دیا، مگر یہ نہایت افسوسناک امر ہے کہ جسٹس کلدیپ سنگھ نے بلا وجہ فیصلہ میں یکساں سول کوڈ کا مسئلہ اٹھا دیا اور یہ کہا کہ اس طرح کے کسی قانون کی عدم موجودگی، ہندو شوہروں کو اسلام قبول کرنے پر اکساتی ہے تاکہ وہ مسلمان بننے کے بعد اپنی بیویوں کے رہتے ہوئے اور ان کو بغیر طلاق دیے ہوئے ایک یا ایک سے زیادہ مزید عورتوں سے شادی کر سکیں، انہوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ دستور کی دفعات نمبر ۲۵، ۲۶، ۲۷ کے تحت مذہبی آزادی کی

جو ضمانت دی گئی ہے یکساں سول کوڈ اس کے خلاف نہیں ہے، جسٹس کلدیپ سنگھ کے اس خیال سے جسٹس سہائے نے اتفاق نہیں کیا، انہوں نے سپریم کورٹ کے ایسے چند فیصلوں کا حوالہ دیا جن میں یہ کہا گیا تھا کہ مذہب محض ایمان و عقیدہ کی بات نہیں ہے بلکہ اسمیں عبادات کی مختلف شکلیں، رسوم (بشمول شادی کے رسوم) اور عبادت گاہوں میں کی جانے والی دعائیں بھی داخل ہیں، عرضداشتوں کو خارج کرنے کے فیصلہ میں جسٹس کلدیپ سنگھ نے جسٹس سہائے کی تائید و موافقت کی ستایش کی (حالانکہ جسٹس سہائے نے مشترکہ سول کوڈ کے آزادیٔ مذہب کے خلاف نہ ہونیکی تائید نہیں کی) لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ان دونوں ججوں نے غیر شعوری طور پر آرٹیکل ۱۴۵ (۵) کو نظر انداز کر دیا جسکی رو سے سپریم کورٹ کے مقدمہ میں اس کی سماعت کرنے والے جج کثرت رائے ہی سے کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں، یہاں تو یہ نازک صورت حال پیدا ہوگئی تھی کہ دونوں ججوں میں اختلاف رائے تھا اس لیے اس امر پر کہ یکساں سول کوڈ آزادیٔ مذہب کے خلاف ہے یا نہیں فیصلہ ہی نہیں دیا جاسکتا تھا، یہ بدقسمتی ہے کہ یکساں سول کوڈ کے موافق و مخالف دونوں کی موافقت اور مخالفت دستور اور ان قوانین سے لاعلمی پر مبنی ہے جو ہندو اور مسلمانوں سے متعلق ہیں، چنانچہ کلدیپ سنگھ نے مندرجۂ ذیل حیرتناک تجویز پیش کی اور اس کی تائید مسٹر سہائے نے بھی کی کہ :

> "ہم وزیر اعظم کے توسط سے حکومت ہند سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ دستور ہند کی دفعہ ۴۴ پر از سر نو غور کرے اور ہندوستان کے سارے شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ کے حصول کی کوشش کرے"۔ (ایضاً ص ۶۵)

چونکہ اس تجویز کی بنیاد آرٹیکل ۴۴ کے ذریعہ تفویض کردہ "اختیارات" پر ہے اسلیے

مناسب ہے کہ یہاں آرٹیکل ۳۷ اور ۴۴ کی وضاحت کردی جائے، آرٹیکل ۳۷ کے مطابق دستور کے اصول و ضوابط اور مشمولات عدالت کے ذریعہ قابل نفاذ نہیں البتہ وہ ملک کی حکمرانی کے لیے بنیادی ہیں اور یہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ قانون بنانے میں انکا اطلاق کرے، آرٹیکل ۴۴ میں کہا گیا ہے کہ ریاست تمام شہریوں کے لیے پورے ملک میں یکساں سول کوڈ کے حصول کی کوشش کرے، چونکہ سپریم کورٹ آرٹیکل ۴۴ کو نافذ نہیں کر سکتی اس لیے اس کی مذکورہ بالا تجویز یا حکم بھی باطل ہوجاتا ہے، یہ عدلیہ کی نہیں بلکہ عاملہ کی ذمہ داری ہوتی ہے، وہی جن قوانین کو مناسب خیال کرتی ہے انہیں پارلیمنٹ میں پیش کرتی ہے اور صرف پارلیمنٹ طے کرتی ہے کہ وہ یہ قانون پاس کرے یا نہ کرے جن لوگوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے شرعی قوانین کا بغور مطالعہ کیا ہے ان کے نزدیک نہ صرف ان دونوں قوموں کے لیے یکساں سول کوڈ ناممکن ہے بلکہ خود تمام ہندوؤں کا سول کوڈ بھی مشترک نہیں ہوسکتا، بظاہر "ہندو لا" بولنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ہندوؤں کے لیے ایک ہی قانون ہے لیکن ایسا نہیں ہے، ۵۶-۱۹۵۵ء سے قبل ہندو لا دو بڑے مکاتب فکر متاکشرا اور دیابھاگ پر مشتمل تھا........

۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۶ء میں ہندو میریج ایکٹ، ہندو سکسیشن ایکٹ، ہندو مائناریٹی اور گارجین شپ ایکٹ، ہندو اڈاپشن اینڈ مینٹی نینس ایکٹ پاس ہوئے، ڈی۔ ایف۔ ملا کی کتاب "ہندو لا" کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس قانون میں کچھ اہم تبدیلیاں کی گئی ہیں ۱۹۵۵ء کے ایکٹ کے بعد تعدد ازدواج کا خاتمہ ہوا اور ہندو بیوہ یا ہندو غیر شادی شدہ عورت کو بیٹا یا بیٹی گود لینے کا حق ملا۔ ہندو میریج ایکٹ کے تحت دو طرح کی شادیاں ہوتی ہیں جنھیں مذہبی اور نا مذہبی یا سول میریج کہہ سکتے ہیں، اس ایکٹ کی دفعہ ۷ (۱)

اور (۲) کے مطابق "ایک ہندو شادی طرفین میں سے کسی ایک کے رسم ورواج کے مطابق انجام پاسکتی ہے" اور "جہاں رسم ورواج میں سپت پدی (مقدس آگ کے سامنے دولہا دلہن کا سات قدم ساتھ ساتھ چلنا) شامل ہے وہاں ساتویں قدم کے ساتھ شادی مکمل ہوجاتی ہے"۔ اگر جسٹس کلدیپ سنگھ نے ان پر غور کیا ہوتا تو وہ یہ نہ کہتے کہ شادی کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں، یہی نہیں ہندو میرج ایکٹ کی دفعہ (۵) (۴) اور (۵) نے شادی کے لیے یہ شرائط بھی عائد کی ہیں کہ "طرفین ممنوعہ رشتوں کی حد میں نہ آتے ہوں، الا یہ کہ دونوں میں سے ہر فریق کے رسم ورواج ان کے درمیان شادی کی اجازت دیتے ہوں" اور "طرفین آپس میں سپنڈ (ایک ہی جسم کے اجزاء) نہ ہوں، بجز اس کے کہ دونوں میں سے ہر فریق کے رسم ورواج میں ان کی شادی کی اجازت ہو"۔ اس طرح یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ہندوؤں میں شادی کے لیے کوئی مشترکہ سول کوڈ نہیں ہے۔

اب مسلمانوں کے مذہبی قوانین کا حال دیکھیں، "یہ دو خاص اور بڑے اور متعدد ذیلی فرقوں میں منقسم ہیں، سُنی اور شیعہ دو خاص اور بڑے فرقے ہیں، سُنی چار ذیلی فقہی فرقوں یا مسلکوں یعنی حنفی، مالکی، حنبلی اور شافعی میں منقسم ہیں، ان کے مقدموں میں فریقین کے مسلک کے مطابق محمڈن لا نافذ ہوگا" (دیکھئے، ملا، محمڈن لا، انیسواں[19] ایڈیشن، صفحات نمبر ۲۱-۲۰ = ۱۹۹۰) اس سے واضح ہے کہ محمڈن لا یکساں طور پر تمام مسلمانوں پر نافذ نہیں ہوگا۔ ایک بات اور ہے کہ محمڈن لا ایک مشترکہ خاندان کو نہیں مانتا، حقیقت ہے کہ مسلم قوانین کے تحت وراثت لازمی طور پر خاندان کے تمام افراد کو نہیں ملتی، خاندان کے متعدد افراد (مرد و عورت) وراثت کے حق دار نہیں ہوتے بقول ملا جب مسلمان

خاندان کے افراد ساتھ ساتھ رہتے ہیں تو وہ اس معنی میں مشترکہ خاندان کی تشکیل نہیں کرتے جس معنی میں یہ لفظ ہندو لا میں استعمال ہوتا ہے، یہ بالکل واضح ہے کہ مشترکہ خاندان کا جو تصور ہندو شادی ایکٹ اور ہندو وراثت ایکٹ میں ہے وہ مسلمانوں، عیسائیوں، یہودیوں، پارسیوں اور ان جیسے دوسرے مذہبی فرقوں پر نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح ہندو شادی ایکٹ کی دفعہ ۲(۲) ہندو وراثت ایکٹ کی دفعہ ۲(۲) ہندو متبنی ایکٹ کی دفعہ ۲(۲) اور ہندو نان نفقہ ایکٹ کی دفعہ ۳(۲) میں وضاحت کی گئی ہے کہ ان کا کوئی جز وقبائل درج فہرست کے افراد پر دستور کے آرٹیکل ۳۶۶ (۲۵) کے مفہوم میں نافذ نہیں ہوگا، سوائے اس کے کہ مرکزی حکومت اس کے لیے کوئی نوٹی فکیشن کی ہدایت کرے۔ لیکن ابھی تک ایسا کوئی حکم جاری نہیں کیا گیا۔ اس لیے یکساں سول کوڈ ایک سراب ہے اور بس۔

اخبار علمیہ

معہد الدراسات الاسلامیہ والعربیہ دہلی کے ایک قابل قدر انگریزی سہ ماہی مجلہ مسلم اینڈ عرب پرسپیکٹیوز' کا ذکر ان کالموں میں آچکا ہے۔ اب اسی ادارہ نے مجلۃ التاریخ الاسلامی' جرنل آف اسلامک ہسٹری کے نام سے ایک اور سہ ماہی رسالہ شایع کیا ہے جس میں یہ احساس کارفرما ہے کہ دنیا کی مختلف زبانوں میں خاص تاریخ وعلوم تاریخ کے مطالعہ وتحقیق کے تو ادارے قائم ہیں جن کی جانب سے کتب ورسائل کی اشاعت ہورہی ہے لیکن تاریخ اسلام کے لیے کوئی ایسا مجلہ کسی زبان میں موجود نہیں ہے، جس کا مقصد اسلام کی مظلوم تاریخ سے انصاف اور اس کا معروضی موضوعی اور غیر جانب دارانہ مطالعہ کرنا ہو، نیز مستشرقین کے مطالعہ وتحقیق کے غلط نتائج کا جائزہ لینا اور اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں تاریخ اسلام کے درس وتدریس کا ایک جدا اور مستقل منہج قائم کرنا ہو، پہلے شمارہ میں کل ۲۱۰ صفحات ہیں، ۱۱۰ عربی اور باقی انگریزی مضامین پر مشتمل ہیں، عربی حصہ میں اندلس' ابن خلدون' امیر محمد الخامس اور تحریک احمد بن نصر خزاعی کے متعلق مضامین ہیں، انگریزی حصہ میں بنگال کے نواب عبداللطیف' سید احمد شہیدؒ اور تحریک مجاہدین پر عمدہ مقالات کے علاوہ مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی مرحوم کا ایک مفید مضمونؒ ہندوستان میں اسلام' کے عنوان سے ہے۔ منی پور اور مالا بار میں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق پرازمعلومات

تحریریں بھی ہیں' مجلہ کی طباعت اور کاغذ کا معیار بلند ہے، مجلس ادارت میں مصر، عراق اور سعودی عرب کے ممتاز اہل قلم شامل ہیں، مجلہ کے مدیر جناب ظفر الاسلام خاں اس رسالہ کے اجرا پر مبارکباد کے مستحق ہیں' پتہ یہ ہے: پی او بکس ۱۰۰۹، ڈی ۴۰، ابوالفضل انکلیو' جامعہ نگر' نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

عربی زبان وادب نے خاص خطہ عرب کے علاوہ دنیا کے جن اور علاقوں میں اپنا غیر معمولی اثر قائم کیا ان میں سب سے زیادہ نمایاں افریقہ خصوصاً سوڈان سے صحرائے مغرب تک کا علاقہ ہے، اب بعض ارباب ذوق وتحقیق نے ان علاقوں کے عربی ادب کی تاریخ اور اس کے آثار ونقوش کو مدون ومرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے، معلوم ہوا ہے کہ افریقی عربی ادب کے ایسے شہ پاروں کو جن کا تعلق مشرقی افریقہ یعنی موجودہ سوڈان سے ہے، جمع کرکے چھ جلدوں میں شایع کرنے کا منصوبہ قریب تکمیل ہے اور اس کی پہلی جلد حال ہی میں لیڈن (ہالینڈ) سے طبع بھی ہوگئی ہے، اس پہلی جلد میں سنہ ۱۹۰۰ء تک کے سوڈان کے عربی ادب کا احاطہ کیا گیا ہے، یہ ۱۲ ابواب میں ہے، پہلے تو اس علاقہ کی عربی تحریروں کا عمومی جائزہ لیا گیا ہے، پھر ایک باب میں سنہ ۱۸۲۰ء تک' دوسرے باب میں سنہ ۱۸۲۱ء سے سنہ ۱۸۸۵ء تک مختلف دبستانوں خصوصاً مذہبی شاعری پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، اس سلسلہ میں ادریسیہ' سنوسیہ' اسماعیلیہ' ہندیہ' قادریہ' سعدیہ' تیجانیہ اور ادب المجاذیب وغیرہ مختلف سلاسل وطرق کی ادبی وشعری نگارشات عالیہ کو جمع کیا گیا ہے۔

فراعنہ مصر میں فرعون رعمسیس ثانی کی ملکہ نفرتاری (نفرتیتی) اپنے عہد کی نہایت خوبصورت عورت تھی، رعمسیس کی حکمرانی کا زمانہ ۱۳۰۴ سے ۱۲۳۶ قبل مسیح بنایا

جاتا ہے جو مصری تہذیب کا عہد عروج بھی ہے، قریباً ۳۲۰۰ سال سے اس بادشاہ کی ملکہ نفرتیتی کا مقبرہ وادی الملکات میں ایک پہاڑی پر موجود ہے، اب پہلی بار مصر کی حکومت نے سیاحوں کو اس میں داخل ہونے کی اجازت اس شرط پر دی کہ وہ چہرہ اور پیروں کو اچھی طرح کپڑوں سے ڈھانک کر جائیں تاکہ وہاں کے نہایت روشن اور چمکدار لیکن نازک ترین نقش ونگار کسی بھی نقصان سے محفوظ رہیں، سیاحوں کے اژدحام سے محکمہ سیاحت خواہ فائدہ میں رہے لیکن یہ مقبرہ کے لیے باعث مضرت ہے، نفرتیتی کی ممی پہلے ہی چوری ہوچکی ہے لیکن اس کے باوجود ملکہ نفرتیتی کی موجودگی مقبرہ کی ان تصویروں کی وجہ سے پوری طرح محسوس ہوتی ہے جو اسقدر تر و تازہ ہیں گویا یہ صرف چند سال پہلے ہی بنائی گئی ہوں، دیواروں پر بنی ایک تصویر میں ملکہ نہایت پر وقار و متانت مآب چہرہ کے ساتھ سفید کلاہ و لباس میں نظر آتی ہے، ایک اور تصویر میں وہ نہایت شان کیساتھ کھڑی ہے، پیروں میں نازک چپلیں ہیں، انگلیاں اور ناخن سفید رنگ سے نمایاں ہیں، کانوں میں بالیاں اور سر پر مصنوعی بالوں کا ٹوپ ہے، مقبرہ کی چھت آسمان اور تاروں کا منظر پیش کرتی ہے، آسمان اپنے اصل آسمانی رنگ میں ہے اور تارے زرد رنگ میں ہیں، ان سے شاید یہ اشارہ مقصود ہے کہ ملکہ کی روح بقائے دوام کی نعمت سے سرفراز ہے۔

انسان کے دست ہنر کی صناعیاں ہزاروں سال سے اب تک جاری ہیں، اب کارنیگی میلان یونیورسٹی کے شعبہ فنون لطیفہ کے پروفیسر لاری برگس نے مصر قدیم کی مکمل تاریخ کو ایک مختصر سے اسپیل کمپیوٹر میں اس طرح جمع کر دیا ہے کہ قدیم مصر کے بازار و معبد، مقابر اور میناں وغیرہ دیکھ کر دیکھنے والا خود کو پانچ ہزار سال پہلے کے مصر میں موجود پاتا ہے، برگس کا خیال ہے کہ موثر اور آسان تفہیم کے لیے کمپیوٹر جو کام کر سکتا ہے وہ کتابیں نہیں کر سکتیں، انہوں نے اپنے اس خیال کو کمپیوٹر کی تکنیک کے ذریعہ واقعتاً صحیح ثابت کر دیا ہے۔

(ع۔ص)

استفسار علمیہ

اکبر کی بیگمات

جناب عبدالرؤف خاں

خاکسار کو شہنشاہ اکبر کی بیگمات کے نام درکار ہیں، کیا 'تاج' نام کی کوئی ملکہ بھی اکبر کے حرم میں تھی؟ ان کے مذہب سے سردست کوئی بحث نہیں، صرف مع ولدیت نام اور تعداد مطلوب ہے۔

معارف: بادشاہ اکبر کی بیگمات کا مرتب و مکمل ذکر عہد اکبری اور مابعد کی کسی تاریخ میں نہیں ملتا۔ صرف منشی ذکاء اللہ صاحب نے تاریخ ہندوستان جلد پنجم میں ایک علاحدہ عنوان کے تحت آٹھ بیگمات کا ذکر کیا ہے لیکن وہ بھی ناقص اور تاج نام کی کسی بیگم کے ذکر سے خالی ہے، جن بیگمات کا ذکر ہے ان میں اکثر کے اصل ناموں کی تصریح نہیں، اس کی وجہ بھی ہے، دراصل تیموری سلاطین کے دستور کے مطابق از روئے عزت و احترام آباء و اجداد کا نام نہیں لیا جاتا اور یہی روایت بیگمات کے سلسلہ میں بھی تھی، جن کو خطابات سے سرفراز کیا جاتا تھا تاکہ ان کا نام لوگوں کی زبان پر نہ آئے۔ (عمل صالح، ص ۲۴) تاہم تلاش و تفحص سے اکبر کی جن بیگموں کا پتہ چلا ہے انکی تفصیل یہ ہے:

۱۔ **سلطان رقیہ بیگم:** یہ ہندال مرزا (اکبر کے چچا) کی بیٹی اور اکبر کی پہلی بیوی تھیں، خدیجۃ الزمانی کا لقب دربار شاہی سے عطا ہوا تھا، لاولد تھیں، شاہجہاں کی پرورش اور تربیت انہی کے زیر سایہ ہوئی۔

۲۔ **سلطان سلیمہ بیگم:** یہ بابر کی نواسی یعنی شہزادی گل رخ بیگم کی

بیٹی تھیں ان کے والد مرزا نورالدین محمد، خواجگان کاشغر کے خاندان سے تھے، یہ اول خانخاناں بیرم خاں کے عقد میں تھیں، اس کے مرنے کے بعد ۹۶۸-۶۹ھ / ۱۵۶۱-۶۲ء میں اکبر کے حرم میں داخل ہوئیں، ان کا ذکر حج کے سفر کے سلسلہ میں شہزادی گلبدن بیگم کے ساتھ بھی آتا ہے۔

۳۔ عبدالواسع نامی ایک شخص کی بیوہ، اس سے ۹۷۰ھ میں نکاح ہوا، منشی ذکاء اللہ صاحب نے صرف اتنا ہی لکھا ہے لیکن منتخب التواریخ میں مزید تفصیل ہے کہ بادشاہ کا دل دہلی کی ایک عورت پر بری طرح آگیا وہ عبدالواسع کی زوجہ تھی، بادشاہ کی خواہش اور مطالبہ پر عبدالواسع نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، اسے شاہی حرم میں داخل کر دیا گیا اور بیچارہ عبدالواسع اس شرم کے مارے دہلی چھوڑ کر دکن میں بیدر میں بس گیا (منتخب، مترجمہ محمود احمد فاروقی: ص ۳۵)

۴۔ **سلطان سلیمہ بیگم**: یہ مذکورہ بالا سلطان سلیمہ بیگم کے علاوہ ہیں، منتخب التواریخ میں لکھا گیا ہے کہ وہ جمال خاں میواتی کی بیٹی اور حسن خاں میواتی کی بھتیجی تھی۔

۵۔ **ہمشیر سلیمہ بیگم**: یہ جمال خاں میواتی کی بیٹی تھی، یہ بھی اکبر کے حرم میں داخل تھی، اس کی موت یا طلاق کا ذکر نہیں، لیکن خیال ہے کہ حرم شاہی سے اس کے نکلنے کے بعد ہی سلیمہ بیگم جو اس کی چھوٹی بہن تھی حرم میں داخل ہوئی ہوگی (منتخب: ص ۵۵)۔

۶۔ **جودھ بائی**: اس کا ذکر منشی ذکاء اللہ صاحب نے کیا ہے اور لکھا ہے کہ جہانگیر کی والدہ تھی، لیکن یہ قطعی غلط ہے، جہانگیر کی والدہ مریم الزمانی بیگم تھیں،

۷۔ **مریم الزمانی بیگم**: یہ راجہ بھارامل یا بہاری مل اور بینی پرساد کے بقول بھرمل BHARMAL والی انبیر کی بیٹی، راجہ بھگوان داس کی بہن اور راجہ مان سنگھ کی پھوپھی تھی، ۹۶۹ھ / ۱۵۶۱ء میں سانبھر کے مقام پر یہ عالی خاندان خاتون بیگمات اکبری میں داخل ہوئی، ان کا اصل نام عام طور سے نہیں ملتا، وہ اپنے خطاب مریم الزمانی بیگم سے مشہور ہوئیں، یہ خطاب بھی ان کو جہانگیر کی پیدائش کے بعد دیا گیا، صرف منتخب التواریخ کے مترجم و محشی نے ان کا نام سروپ بتایا ہے جو بعد میں عارف النساء بیگم ہوا، لیکن اس کے لیے انہوں نے کوئی حوالہ نہیں دیا، (دیکھیے منتخب التواریخ مترجم محمود احمد فاروقی: ص ۵۳، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز پاکستان) ان کو جودھ بائی سمجھنے کا سہو صرف مولوی ذکاء اللہ صاحب سے ہی سرزد نہیں ہوا، بقول بینی پرساد "بلوکمان نے سب سے پہلے یہ غلطی کی گو بعد میں اس نے اپنی غلطی کی تصحیح کر لی، بیورج نے تو حد کر دی کہ سلطان سلیمہ بیگم کو جہانگیر کی والدہ قرار دیا، اس سلسلہ میں مولوی سعید احمد مارہروی کی یہ تحقیق قابل ذکر ہے کہ

"جودھ بائی کو عام لوگ اکبر کی بیگم سمجھتے ہیں، حالانکہ اکبر کی بیگمات میں اس خطاب کی کوئی بیگم موجود نہیں تھی، جودھ بائی دراصل جہانگیر کی بیگم تھی، یہ راجہ اودے سنگھ راٹھور عرف موٹہ راجہ والی جودھ پور کی بیٹی تھی، اصل نام مان متی تھا اور بوجہ علم و فضل جگت گسائیں کے خطاب سے موصوف تھیں ۹۹۴ھ میں جہانگیر کے ساتھ شادی ہوئی" (تاریخ فتحپور سیکری: ص ۱۱۳، ۱۱۴)

۸۔ بیکانیر کے راجہ رائے کلیان مل کی صاحبزادی، یہ اکبر کے حرم میں ۱۵۷۰ء میں داخل ہوئی۔

۹۔ جیسلمیر کی راجکماری، یہ بھی سنہ ۱۵۷۰ء میں حرم شاہی میں داخل ہوئی (اکبر اینڈ ریلیجن؛ خلیق احمد نظامی: ص ۴۳۰)

۱۰۔ **بی بی دولت شاہ** : ان کے اصل نام اور والد کے نام کی صراحت نہیں ملتی، ان سے اکبر کی دو صاحبزادیاں شکر النساء بیگم اور آرام بانو بیگم پیدا ہوئیں، شاہجہاں کے زمانہ میں سنہ ۱۶۶۳ء میں بمقام متھرا ان کا انتقال ہوا (ہسٹری آف جہانگیر، بینی پرساد: ص ۹)

۱۱۔ **ترکی سلطانہ** : اس کے متعلق مولوی سعید احمد مارہروی نے لکھا ہے کہ "اس کے مکان کو جہلاء تبنولن کا محل اور اکثر لوگ بیگم استنبول کا محل بھی کہتے ہیں، چونکہ بیگمات اکبری میں استنبول کی کسی بیگم کا ہونا تاریخ سے ثابت نہیں ہے لہذا کیا عجب ہے یہ سلیمہ بیگم کا مکان ہو" (تاریخ فتحپور سیکری: ص ۹۱)

۱۲۔ اکبر کی ایک بیٹی شہزادہ خانم کا ذکر بھی ملتا ہے، اس کی والدہ کا نام بھی پردۂ خفا میں ہے، مورخین اسے ایک خواص سے تعبیر کرتے ہیں، بیورج اور رائس نے سلطان سلیمہ بیگم کو اس کی والدہ بتایا ہے مگر بغیر کسی قرینہ اور حوالہ کے۔

۱۳۔ عبداللہ خاں مغل کی بیٹی، ۹۶۴ھ / ۱۵۵۷ء میں یہ اکبر کے عقد میں آئی۔

۱۴۔ **شادبی بی** : ان کا ذکر صرف منشی ذکاء اللہ صاحب نے کیا ہے۔

۱۵۔ میراں مبارک شاہ خاندیش کی بیٹی، ان سے ۹۷۱ھ / ۱۵۶۴ء میں نکاح ہوا (اکبر اینڈ ریلیجن، کرانولوجی آف اکبرس رین، نظامی: ص ۴۲۹)

ان بیگمات کے علاوہ شہزادہ مراد کی والدہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک خواص تھی، اسی طرح شہزادہ دانیال کی والدہ کے بارے میں بھی صراحت نہیں ملتی، مرقع

اکبرآباد میں ایک مقبرہ بی بی ایشر دی بیگم کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ غالباً یہ اکبر یا جہانگیر کی کوئی راجپوت بیگم تھی۔

یہاں اس واقعہ کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جب اکبر نے تعداد ازدواج کے مسئلہ پر علماء سے یہ پوچھا کہ کتنی آزاد عورتوں کو نکاح میں رکھنا درست ہے، علماء نے جب اس کو شریعت کی رائے سے باخبر کیا تو اس نے کہا کہ "ہم تو جوانی میں اس کے پابند نہیں رہے، جتنی عورتوں کو چاہتے تھے نکاح میں لے لیتے تھے خواہ وہ آزاد ہوں یا غلام"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے حرم کی تعداد خاصی تھی، منتخب التواریخ کی اس عبارت سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ "ہندوستان کے بڑے بڑے راجاؤں کی بہت سی لڑکیاں حرم شاہی میں تھیں، وہ بادشاہ کے مزاج پر بہت حاوی تھیں" ابوالفضل نے آئین شبستان اقبال میں "فزودنی پردگیاں" کہہ کر ایک اشارہ ضرور کر دیا ہے کہ عورتوں کی زیادتی جو ہوشیار آدمی کو "ظلمت کدۂ طبیعت" میں ڈال دیتی ہے، اکبر کے لیے "فروغ بنیش" کا ذریعہ بن گئی، اصل الفاظ یہ ہیں "فزودنی پردگیاں کہ بزرگ دانشاں را بظلمت کدۂ طبیعت برد گیتی خدیو را فروغ بنیش افروز" 'فزودنی پردگیاں' کی وسعت کا اندازہ ابوالفضل کی اس عبارت سے ہو سکتا ہے کہ "ہر یکے از پردگیاں را کہ از پنج ہزار افزوند جداگانہ منزلے نامزد گرداند" بہت بعد میں یعنی ۹۹۵ھ میں یہ قانون دین الٰہی نافذ ہوا کہ لوگ ایک سے زیادہ نکاح نہ کریں بجز اس کے کہ عورت بانجھ نکلے، چونکہ خدا بھی ایک ہے اس لیے بیوی بھی ایک ہونی چاہیے" (منتخب التواریخ: ص ۵۲۸)

ادبیات

نعت

از جناب وارث ریاضی چمپارن

وہ جو جلوہ گاہِ رسول ہے وہ جو قبلہ گاہِ انام ہے
مرا کاروانِ نگاہ و دل اسی سمت محوِ خرام ہے

جسے رہنمائے بشر کہیں وہ عمل کا ماہِ تمام ہے
وہ حبیبِ ربِّ کریم ہے، وہ نبیٔ خیرِ انام ہے

وہ رؤف بھی ہے رحیم بھی، ہے ستم زدوں کا رفیق بھی
وہ اسی کی ذاتِ عظیم ہے جو جہاں میں مرجعِ عام ہے

زہے رفعتِ شہِ انبیاء جو ملی کسی کو نہ مل سکے
جسے مہر و ماہ نہ پا سکیں یوں بلند اس کا مقام ہے

یہ کمالِ اوجِ یتیم ہے کہ زمیں سے پہنچا ہے عرش تک
جسے ترجمانِ خدا کہیں وہ خدا سے محوِ کلام ہے

وہ جدھر سے گزرا سحابِ لطفِ عمیم بن کے برس گیا
جو خدا کی شانِ ربوبیت کا جہاں میں مظہرِ تام ہے

وہ فروغِ گلشنِ دہر ہے جسے آبروئے جناں کہیں
کہ اسی کے دم سے جہاں میں موجِ بہار مستِ خرام ہے

وہ جو گزرے ذکرِ کریم میں جو بسر ہو یادِ حبیب میں
وہی صبح، صبحِ جمیل ہے وہی شام احسنِ شام ہے

تری کائناتِ حسین میں اسے خدائے بزرگ و مہربان
جو پیام باعثِ امن ہے وہ مرے نبی کا پیام ہے

اسے لوگ مفلس و ناتواں جو کہیں تو ان کا قصور ہے
وہ جو وارثِ شہِ انبیاء ہے غلامِ خیرِ انام ہے

نعت شریف

از ڈاکٹر مقصود احمد مقصود۔ بڑودہ

نیّرِ ایماں، مشعلِ ایقاں، رحمتِ حق ہو تم پہ فراواں
صاحبِ عرفاں، واصلِ یزداں رحمتِ حق ہو تم پہ فراواں

مہرِ نبوت، ماہِ رسالت، منبعِ رحمت، مرجعِ خلقت
ہادیٔ انساں، فخرِ رسولاں، رحمتِ حق ہو تم پہ فراواں

تم ہو حبیبِ خالقِ عالم، لطفِ الٰہی تم پہ ہے پیہم
تم سے محبت، الفتِ رحماں، رحمتِ حق ہو تم پہ فراواں

اسوۂ اعلیٰ مطمحِ مومن، فکرِ اطاعت مقصدِ ہستی
تابعِ حق ہے تابعِ فرماں، رحمتِ حق ہو تم پہ فراواں

دل کے مرض کے تم ہو مسیحا، روح زبوں کے ملجا و ماویٰ
پشت پناہِ عالمِ انساں، رحمتِ حق ہو تم پہ فراواں

عیش و نعم کی نہرِ رواں میں گوہرِ ہستی پھینکنے والا
ہے دمِ آخر بے سر و ساماں، رحمتِ حق ہو تم پہ فراواں

بارِ ندامت سے ہے جبیں خم، پیشِ نگاہِ شافعِ اعظم
چشمِ عقیدت اشک بہ داماں رحمتِ حق ہو تم پہ فراواں

دیکھ نہ لے کیوں جلوۂ حق کو ٹھیک سے میری چشمِ تمنا
ٹھہر گئی ہے گردشِ دوراں، رحمتِ حق ہو تم پہ فراواں

کوئے دیارِ شاہِ زمن ہے، رشکِ جناں مقصودِ پریشاں
کہہ دو کھلا کر دل کا گلستاں، رحمتِ حق ہو تم پہ فراواں

نعت

از ڈاکٹر ابرار اعظمی

تری خاکِ پا، کحلِ نظر — ترے نقشِ پا، طورِ نظر
ترا ہر نفس بادِ سحر — تری ہر نظر، حسنِ نظر
تو بنائے کن تو عطائے کن — ہو تری حیات پہ گر نظر
تو سراپا رحمتِ ایزدی — ترا ہر عمل، تری ہر نظر
اسے ہونا مرجعِ خلق ہے — پڑے جس کسی پہ تری نظر

تو شفیع، مذنب و خاصی میں
تو خدارا مجھ پہ بھی اک نظر

مطبوعات جدیدہ

تاریخ علوم میں تہذیب اسلامی کا مقام

از ڈاکٹر فواد سنرگین مترجم ڈاکٹر خورشید رضوی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، صفحات ۴۸۰، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: ادارہ تحقیقات اسلامی، الجامعۃ الاسلامیۃ العالمیۃ، اسلام آباد۔ پاکستان۔

ترکی کے مشہور عالم و محقق ڈاکٹر فواد سنرگین محتاج تعارف نہیں، اسلام و عرب کی علمی و تمدنی تاریخ پر ان کی گہری نظر ہے، تاریخ التراث العربی ان کا سب سے قابل قدر کارنامہ ہے، انہوں نے ریاض کی جامعۃ الامام محمد بن سعود کی دعوت پر ۱۹۷۹ء میں چند توسیعی خطبات دیے تھے، بعد میں متعدد اور مقالات کے اضافہ کے ساتھ ان کو کتابی شکل میں شایع کر دیا گیا، یہ مجموعہ خطبات بجا طور پر ان کے وسیع مطالعہ اور برسوں کی تحقیقات کا نچوڑ ہے، جس میں علوم طب و کیمیا، ریاضیات و فلکیات و آثار علویہ میں مسلمانوں کی کاوشوں اور ایجادات کا جائزہ لینے کے علاوہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ پر اسلام کے اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے، دو مقالوں میں کتاب الاغانی کے مآخذ اور قدیم عربی شاعری پر بہترین بحث کی گئی ہے آخری باب میں اسلامی ثقافت کے موجودہ جمود و تعطل کے اسباب بیان کئے گئے ہیں، صاحب خطبات نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ استشراق کے سایہ میں بسر کیا ہے، طالب علمی سے درس و تدریس تک ان کو براہ راست مستشرقین سے سابقہ رہا اس لیے استشراق کی نفسیات سے وہ

بخوبی باخبر ہیں، ان خطبات کا مرکزی نقطہ اس غلط تصور کا رد و ابطال ہے کہ "علوم کا ارتقاء صرف دو سیاسی مرحلوں سے گزرا ہے یعنی ایک یونان قدیم کا اور دوسرا یورپ کی تحریک احیائے علوم کا" مصنف نے ثابت کیا ہے کہ درحقیقت یہ دونوں اپنے وجود کے لیے عربوں کے مرہونِ منت ہیں، قرونِ اولیٰ کا اسلامی معاشرہ مختلف مکاتب فکر کا نقطۂ اتصال ہے جبکہ اس سے پہلے یہ سارے عناصر بکھرے اور ایک دوسرے کے لیے بے اثر تھے، اسلام کی ایک برکت یہ بھی رہی کہ اس نے ان مختلف عناصر میں ربط قائم کر کے فکرِ انسانی کے ایک نئے دور کی ابتدا کی اور ان کے فیضان کو فراخدلی سے عام کیا، مسلمانوں نے استفادہ اور تقلید کے مرحلوں کو بہت جلد طے کر کے ان علوم کو ابداع و اختراع کی منزلوں تک پہنچا دیا، لاطینیوں نے عربوں سے استفادہ و تقلید کی روایت تو برقرار رکھی مگر عرب ان کے سیاسی و دینی حریف تھے اسی لیے دشمنی اور بغض کے اثرات سے لاطینی خود کو محفوظ نہیں رکھ سکے، چنانچہ انہوں نے مسلمانوں اور عربوں کے فیضان و احسان کی اگر وضاحت و صراحت نہیں کی تو اس کی وجہ یہی تھی اور یہی بعد میں استشراق کی خشتِ اول بنی، تاہم اب ناانصافی کے بادل چھٹ رہے ہیں اور یہ امید بندھی ہے کہ اسلامی و عربی علوم کا اعتراف مستقبل میں عدل و انصاف سے کیا جائے گا، یہ قابلِ قدر کتاب پُرمغز مباحث کی وجہ سے علوم اسلامیہ کے ہر قدرداں کے مطالعہ کے لائق ہے لائق مترجم جو ادارۂ تحقیقات اسلامی کے شعبہ ترجمہ کے صدر بھی ہیں، سلیس و شگفتہ ترجمہ کے لیے لائق مبارکباد ہیں۔

مولانا باقر آگاہ ویلوری، شخصیت اور فن از ڈاکٹر ذاکرہ غوث

متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات

۶۱۶، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، علی گڑھ، بمبئی اور مصنفہ کا پتہ: ۱۴۴۔ لائیڈز روڈ، مدراس، ۸۶۔

مولانا باقر آگاہ ویلوری سرزمین دکن کے ایک مایہ ناز شخص تھے، جن کی علمی و ادبی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں، وہ عالم دین، باکمال ادیب و نقاد و شاعر اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے، کچھ عرصہ پہلے ان کے ادبی نوادر کے متعلق ان صفحات میں جناب علیم صبا نویدی کی ایک کتاب پر تبصرہ ہو چکا ہے، اب زیر نظر کتاب میں قریباً دو سو صفحات میں ان کے سوانح اور چار سو صفحات میں ان کی اردو، عربی و فارسی تصانیف کا مفصل جائزہ بڑی محنت و تحقیق سے لیا گیا ہے، لائق مصنفہ جنوبی ہند کے قدیم ذی علم عرب خاندان قبیلہ نوائط سے تعلق رکھتی ہیں، علم و تحقیق سے ان کے غیر معمولی شغف کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ۷۵ سال کی عمر میں انہوں نے گذشتہ سال مدراس یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، زیر نظر کتاب بھی دراصل ان کے ڈی لٹ کا مقالہ ہے جو ۱۹۷۴ء میں پیش کیا گیا تھا، لیکن اب قریباً بیس برس کی فرید تحقیق کے بعد شایع ہوا ہے، محنت و تلاش کا اندازہ مراجع و مآخذ کی کثرت اور مباحث کی ترتیب و تدوین سے بآسانی کیا جا سکتا ہے، انہوں نے صرف سوانح پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مولانا آگاہ کے اٹھارویں صدی کے عہد کی سیاسی و سماجی تاریخ بھی بیان کر دی ہے، قبیلہ نوائط پر بھی مفید معلومات جمع کیے گئے ہیں، اس طرح مولانا آگاہ کے حالات سے آگاہی کے لیے یہ کتاب خود ایک معتبر ماخذ بن گئی ہے، البتہ کتابت کے سہو سے یہ خالی نہیں مثلاً ص ۹۲-۹۳ پر النفحۃ العنبریہ فی مدحۃ خیر البریہ کا ذکر تین بار کیا گیا اور ہر بار غلط لکھ کر۔

مجھے ہے حکم اذاں: از جناب مولانا عتیق الرحمن سنبھلی متوسط تقطیع بہترین کاغذ اور کتابت وطباعت صفحات ۲۶۴ قیمت ۵۵ روپے پتہ: الفرقان بکڈپو نظیرآباد لکھنؤ ۲۶۶۰۱۸۔

یہ کتاب جناب مولانا سنبھلی کی ان تحریروں کا مجموعہ ہے جو رسالہ الفرقان لکھنؤ میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں، اس سے پہلے انکا ایسا ہی ایک اور مجموعہ 'راستے کی تلاش' کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اسمیں ان کے اداریے تھے، زیر نظر کتاب میں مذہبی اور علمی مضامین ہیں، جیسے زفرق تا بقدم، تہذیب نو کو عقیدے کی تلاش، تسخیر کائنات کا مطلب، مسیح قرآنی یا مسیح انجیل اور فتنہ پرویز وغیرہ، آخرالذکر مضمون بہت مفصل ہے اور حقیقتاً یہی اس مجموعہ کا سب سے مفید و قیمتی مضمون ہے، اس میں حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت اور الائمۃ من قریش پر جو بحث کی گئی ہے اسکے متعلق ہم مصنف کے اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ "اس سے آئندہ کسی پرویزی حیلہ کے لیے مطلب برآری کی کوئی راہ نہیں کھل سکے گی"۔ مضامین کے تنوع اور فاضل مولف کے دلکش اور پراثر اسلوب کی وجہ سے یہ کتاب ہر صاحب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے اور جی چاہتا ہے کہ ان کی اور بکھری ہوئی تحریریں بھی اسی طرح خوبصورت لڑیوں میں پرو دی جائیں۔

تابشیں: از جناب انجم صدیقی متوسط تقطیع کاغذ اور کتابت وطباعت گوارا، مجلد مع گردپوش، صفحات ۱۵۲، قیمت ۳۰ روپے پتہ: دارفی بک اسٹال بہرائچ۔ یوپی۔

جناب انجم صدیقی جواں سال شاعر ہیں، ان کے والد بہرائچ کے صوفی منش بزرگ تھے اسلیے بادۂ تصوف کے رنگ و مزہ سے یہ بھی ناآشنا نہیں ہیں، غزل ان کی محبوب صنف سخن ہے، اس طرح انکے کلام میں تغزل و تصوف دونوں کا اثر ہے، یہ دو شعر ملاحظہ ہوں:

سر محشر مرے اعمال کا دفتر کھلے جس دم — کسی کی نسبت دیرینہ دامن گیر ہو جائے

متاع درد مشکل سے عطا ہوتی ہے اے انجم — کسی کا درد میرے قلب کی جاگیر ہو جائے

امید ہے کہ ان تابشوں کے ذریعہ انکے فکر و فن کا جلوہ اور عام ہوگا۔

(ع۔ ص)